سب رس

غالب نمبر

دوسرا حصہ

دسمبر ۱۹۶۹ء

ادارۂ ادبیات اردو

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد (۳۲) شمارہ ۱۲

دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء

ماہنامہ سب رس

غالب نمبر (دوسرا حصہ)

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے - اس پرچہ کی قیمت ایک روپیہ

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

نقد و نظر

اپنی بات

غالب نمبر کی بروقت اشاعت کی خاطر اور ضخامت سے بچنے کیلئے کچھ مضامین روک لئے گئے اور کچھ دیر میں ملے انہیں دوسرے حصّے کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے حصّہ کے متعلق قارئین کرام نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آخر میں دیئے جا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ سب رس نے بھی غالب صدی کے موقع پر بارگاہ غالب میں اپنی استطاعت سے بہت زیادہ بڑھ کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

پیشِ نظر شمارے میں پہلا مضمون جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدر شعبہ اردو وینکٹیشور یونیورسٹی ترو پتی کا ہے جس میں صاحب موصوف نے غالب اور ابوالکلام آزاد کی نرگسیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ابوالکلام آزاد کی انانیت کو غالب کے مقابلے میں بلند و برتر ثابت کیا ہے غالب اس میدان میں جس قدر پیچھے رہ جاتے ہیں اسکا اندازہ محمد منور کی پیش کردہ مثالوں سے ہو سکتا ہے۔ دوسرا مضمون جناب بشیر بدر کا ہے جو موصوف خود ایک وقیع غالب نمبر علی گڑھ میگزین کا شائع کر چکے ہیں جس پر پہلے حصے میں تبصرہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون نہایت عرق ریزی اور محنت سے لکھا گیا ہے اور قارئین سے داد کا طالب ہے۔

پروفیسر افتخار احمد فخر دھولیاوی نے کلام غالب میں شوخی اور ظرافت کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا حالی نے غالب کو "حیوان ظریف" کہا ہے اور ہمارے اکثر و بیشتر تنقید نگاروں نے غالب کے خطوط اور یادگار غالب سے غالب کی ظرافت کے نمونے پیش کئے ہیں لیکن کلام میں جو شوخی اور ظرافت ہے اس کی طرف نسبتاً کم توجہ کی گئی ہے۔ پروفیسر فخر نے اپنے مطالعہ کا حاصل پیش کیا ہے۔

جناب عبدالقادر عزیزی نے غالب کی تحقیق پر روشنی ڈالی ہے۔ اس موضوع پر قاضی عبدالودود صاحب نے بھی لکھا ہے۔ لیکن عزیزی صاحب نے بھی اس کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے۔

جناب تاج الدین خاں صاحب بیابانی نے غالب کی عظمت سے بحث کی ہے اور جناب محمد ایوب صاحب واقف نے غالب کی مختلف اور متعدد کمزوریوں کو منظرِ عام پر لایا ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ شاعر کی اہمیت کو کم کیا جائے بلکہ صرف یہ اظہار مقصود ہے کہ اتنے بلند مرتبہ لوگ بھی اس قدر پستی پر اتر سکتے ہیں گویا شاہین کنجشک فرومایہ کے مقابل میں آجاتا ہے۔

غالب کو جب ہم اخلاق کی کسوٹی پر جانچنا چاہتے ہیں تو وہ کس قدر پستی میں نظر آتے ہیں پہلے مضمون میں بھی (غالب اور ابوالکلام) اس کی مثالیں مل سکتی ہیں اور (غالب بحیثیت محقق) میں بھی۔ لیکن اس سے ہٹ کر جب ہماری نظریں کلام پر پڑتی ہیں تو غالب کی کمزوریاں ماند پڑ جاتی ہیں اور اس کے افکار ہمارے قلب و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔ غالب اپنی کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ اور آتش کی زبان میں جانتے تھے کہ ؎ کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا۔

چنانچہ اپنے متعدد اشعار میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ؎

کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن	سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے

اور کبھی کہتے ہیں ؎ غالبؔ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ؎ شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے۔ کبھی اپنے دل کو یہ کہکر دلاسا دیتے ہیں کہ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے۔ کبھی علانیہ کہتے ہیں کہ ؎ "غالبؔ خاک نشین اہل خرابات سے ہے۔ کبھی یوں بھی تسلی دے دی ہے کہ ؎

بیگانگیٔ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ	کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالبؔ نے اپنے آپ کو ہمیشہ سبز قدم سمجھا جس کی سرپرستی میں گئے اس کو جہان سے اٹھا دیا۔ اس کا ذکر انھوں نے ایک خط میں بھی کیا ہے اور ایک قطعہ بھی یوں کہتے ہیں ؎

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے	جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے	کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے

بہرحال انھوں نے اپنے عادات و اطوار، طور طریق اور اخلاق و خصائل کو خود جانچ کر فیصلہ کر دیا تھا کہ "میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا" جو اتنی انکساری برتے اس کو کیا برا کہا جائے۔ وہ اگر انانیت کے اظہار میں عرش سے پرے ہے تو انکساری میں ننگ وجود بھی۔

مولوی غلام رسول صاحب ڈاکٹر زور مرحوم کے استاد رہے ہیں۔ اردو املا پر آپ کے اکثر مضامین "ہماری زبان" میں شائع ہوے ہیں۔ یہاں مولانا نے اردو املا کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوے غالب کی املا نویسی پر بھی روشنی ڈالی ہے

قیوم صادق صاحب نے لفظ موج سے غالبؔ کے تعلق کا اظہار کر کے ایک نیا موضوع پیش کیا ہے۔

نقد و نظر میں پروفیسر سید محمد صاحب نے غالبؔ اور حیدر آباد اور عیار غالبؔ پر تبصرہ فرمایا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات ڈسمبر کے آخری ہفتے میں ہو رہے ہیں اور سابق کی طرح اب بھی دس تا بارہ مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ تفصیل اگلے شمارے میں پیش ہوگی۔

محمد اکبر الدین صدیقی
ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

ڈاکٹر رضی الدین احمد

غالب اور ابوالکلام

اُردو کے دو بڑے انانیت پسند

کہتے ہیں انسان کے قدرت کا ایک پیمانہ اس کا ضبط بھی ہے۔ انتہائی طیش کے عالم میں بھی اگر آدمی کو اپنی زبان اور ذات پر قابو رہے تو یہ بڑی بات ہے۔ اس اوچھے زمانے کا تو ذکر ہی عبث ہے۔ لیکن غالب کے زمانے میں ضبط کا عالم بہت اعلیٰ تھا۔ شرافت و شائستگی کے تقاضے بہت سخت اور صریحی تھے۔ گو غالب بڑے شاعر تھے لیکن شاعری کا شمار بھی شرفاء کے شوق میں شامل تھا۔ ہر زمانے میں ہر طرح کے ضابطوں کے باوجود شعراء کو بڑی چھوٹ دی گئی ہے، لیکن شرافت و شائستگی کے آداب میں چھوٹ کا گزر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

غالب اور ابوالکلام دونوں دنیائے ادب کے آسمان کے دو بڑے روشن تارے تھے لیکن دونوں کی انانیت کی دنیائیں عجیب و غریب حد تک ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد تھیں۔ دونوں بے حد حساس مگر تیکھا نہ طبیعت کے مالک تھے۔ دونوں کی انانیت کی ایک مشترک قدر یہ ضرور تھی کہ دونوں کی عوام بیزاری بے پایاں تھی۔ دونوں ہر معاملے میں اپنی روش خاص کے حامل تھے لیکن دونوں کی انانیت ضبط اور ذہانت کی منزلوں میں اس درجہ مختلف اور ممتاز ہو جاتی ہے کہ دونوں کی انانیت کا قد صاف صاف پہچانا جا سکتا ہے۔ ضبط اور ذہانت کی وادی میں اپنے مخالفین سے حسن سلوک کے معاملے میں غالب ابوالکلام سے اس درجہ پیچھے رہ جاتے ہیں کہ تعجب اور تاسف کی حد تک ان کی انانیت کے اعلیٰ درجے ادنیٰ شمار کرنے پڑتے ہیں۔ جس شخص کی خودداری کا یہ عالم رہا ہو کہ اس نے خدا سے یہ طرزِ تخاطب اختیار کیا ہو ؎ دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا۔

اور جس نے بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے انفعال سے اپنا دامن سختی سے بچائے رکھا تاکہ کہیں تنوطیت نفس کی ناتوانی کا باعث نہ بن جائے" انفعال کی نسبت اقبالؔ غالب کا ہم نوا تھا جو کہہ گیا تھا کہ انفعال سے زبون ہمت پیدا ہوتی ہے اور زمانے سے عبرت حاصل کر کے زندگی کے متعلق تنوطی نظر پیدا کر لینا نفس کو کمزور کر دیتا ہے ؎

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال   حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

فکرِ اقبال صـ ۲۲۳

وہی غالب اعظم ضبط کی پل صراط پر ثابت قدم نہ رہ سکا۔ اور اس راہ میں اس کی انانیت ضبط سے محروم ہی رہی۔

غالب نے جہاں جہاں اپنے مخالفین اور معترضین کا حال لکھا ہے۔ وہاں ان کی انانیت کی اعلیٰ سطح ادنیٰ بن کر رہ گئی ہے اور وہ ٹھیک اس سطح پر نظر آتے ہیں جو خاص عوام ہی کی سطح ہے۔ اس کے برعکس ابوالکلام کے ہاں نہایت ادنیٰ معترضین اور اپنے بدترین مخالفین کے ذکر میں بھی ان کا وزن اور وقار نمایاں ہے۔ ابوالکلام اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اپنی ہتکی سی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی انانیت اتنی شاندار ہے کہ آپ اپنے سے شرما جاتی ہے۔ ان کے نزدیک کوئی اس قابل ہی نہیں جسے وہ اپنا حریف خیال کریں۔ لیکن غالب اپنے مخالفین اور معترضین سے جو سلوک روا رکھتے ہیں وہ نہ صرف ان کی شان کے منافی ہے بلکہ شرافت و شائستگی کے بھی خلاف ہے۔ اس وجہ سے میں نے غالب کی انانیت کو ابوالکلام کی انانیت سے پست اور ادنیٰ درجے کی انانیت قرار دیا ہے۔

غالب اپنے مخالفین کے ذکر میں کھل گئے ہیں۔ ضبط کا دامن ان کے ذہن سے اور ذہانت کا قدم ان کی شان کی دہلیز سے ہٹ گیا ہے۔ وہ بھول گئے کہ مخالفین اور معترضین سے ان کا درجہ کس قدر بلند واقع ہوا ہے۔ اس لئے وہ بلا غل و غش انہیں جلی کٹی سناتے ہیں۔ ایک کم ظرف اور بدزبان شخص کی سطح پر آکر وہ انانیت کا اعلیٰ مرتبہ اور اولین مطالبہ تک بھول جاتے ہیں۔

ابوالکلام کی باوقار انانیت نے اپنا حق ادا کر دیا۔ وہ کسی قیمت پر یہ ننگ گوارا نہ کر سکے کہ اپنے پست اور پاجی مخالفین کی سطح پر اتر آئیں۔ بلکہ اس موقع پر ان کے ہاں شدید تغافل شاہانہ اور شاندار بے نیازی کی خانیاں ان کی شائستگی کی زرہ بکتر بن گئی ہیں۔ ظاہر ہے اس کے لئے غیر معمولی ظرف اور بے پناہ ضبط کی قوت درکار تھی اور ابوالکلام کو یہ دونوں توانائیاں خوب خوب میسر تھیں۔ بقول "عبدالماجد دریابادی" انسان کے ظرف کی یہ ایسی کڑی آزمائش ہے کہ اچھے اچھے اس پر پورے نہیں اترتے انسان کے ظرف کا اندازہ کرنا ہے تو یہاں دیکھنے پر قناعت نہ کیجئے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے بلکہ یہ دیکھئے کہ معترضوں نکتہ چینیوں اور مخالفین کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ مولانا کو اللہ نے اس نعمت خصوصی سے نوازا تھا وہ اپنے مخالفین کے لئے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے علم، رواداری، عالی ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہے"[1]

---

[1] نیا دور اگست ۱۹۵۹ء

غالب اس آزمائش میں پورے نہیں اترتے۔ ابوالکلام کے بے پایاں حوصلے اور بے پناہ ضبط نے غالب کی انانیت کے درجے اتنے ہی پست کر دیئے جتنے اپنے درجے بلند کئے۔

ابوالکلام کی انانیت مولویانہ اور مناظرانہ سطح سے عموماً بلند رہی۔ مخالفین سے ان کا رویہ اس حد تک معقول اور متوازی رہا کہ انانیت کی دنیا میں وہ سما نہ سکا۔ غالب کی ترش روی اور تلخ نوائی ان کی انانیت کی ناپختگی کا راز فاش کرتی ہے۔ ابوالکلام کے ہاں یہ عالی ظرفی اور ذوق بلند کی مثال بن گئی ہے۔ غالب کے مندرجہ ذیل اقتباسات کے بین السطور اس دعوے کی مستند داخلی شہادتیں موجود ہیں۔

وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے ستیاناس جائے بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ نامراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو۔ از تم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب حبتہً للہ کان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے نامراد اور ناکام اور نادرست اور ناچار کہ یہ مخفف ناچارہ اور ناہار کہ یہ مخفف نہ آہار ہے اور نامراد اور ناانصاف یہ سب درست ہیں۔ ہاں کہاں گئے ہانسی والے معلم[۱]

جس فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو یا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب علم کی نظر میں اعتبار پاؤں خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خر ان ناشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و درماندہ کیا بکتا ہوں۔[۲]

نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو۔ مگر اس کھتری بچے اور اس معلم سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل و حکمت کو کام میں لاؤ غور کرو سمجھو۔ عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا واقف غوث الاعظم نہ تھا میں یزید نہیں ہوں شمر نہیں ہوں مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔[۳]

زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور عطیہ خاص منجانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ منطق کا کمال میں نے اپنے اُستاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعر اس میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی تاب ہیں لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب میں[۴]

۱۔ خطوط غالب ص ۵۰۵، ۲۔ خطوط غالب مرتبہ مہر ص ۵۰۵، ۳۔ غ۔ خ۔ م ص ۵۰۶، ۴۔ غ۔ م ص ۶۰۶

فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغات فارسی میں سراسر غلط ہے۔ البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔ خصوصاً۔۔۔۔۔۔ لغو ہے پوچ ہے پاگل ہے دیوانہ ہے وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصل کیا ہے اور یائے زائدہ کیا ہے[1]

ستر برس کی عمر کانوں سے بہرا جمعیت کم تفرقہ زیادہ اور پھر خودداری اور کم نفسی اور استغنا خداداد۔ بیہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں[2]

میں کیوں فرہنگ نگاروں کے اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں اور کیونکر کاتبوں کے املا کو مصحف مجید کی طرح سر پہ دھروں یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کو جماد اور نبات فرض کروں[3]

محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ متوسف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق دافع ہذیان و سوالات عبدالکریم اور لطائف غیبی کو پڑھ کر متنبہ نہوا اور محرق کو دھو ڈالا تو معلوم ہوا کہ بےحیا بھی ہے[4]

اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بہت بحث کروں۔ دو جوتیاں آپ لگا دیں ایک جوتی تم سے لگوا دی البتہ قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔ میں برہان کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا[5]

غالب کے ان تمام اقتباسات میں ان کا طرز کلام ان کی شرافت اور شان کے شایان ہرگز نہیں ہے۔ مخالفین خواہ کچھ کہیں لیکن غالب کو ان مسائل میں مناظرانہ اور عامیانہ انداز سے بہرحال اجتناب کرنا تھا۔ انھوں نے جس زبان اور جس ذہنیت کا مظاہرہ کیا اس سے مخالفین کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن غالب جیسے بڑے فنکار کی جگ ہنسائی کا سامان مہیا ہو گیا۔ انھوں نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور اپنے مخالفین کے دست و گریباں رہے گو انھوں نے یہی کہا کہ میں ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ مگر مقابلہ کیا گو انھوں نے اعتراف کیا کہ بےہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں۔ اس کام میں انھوں نے کافی وقت ضائع کیا اور یہ نہ خیال کیا کہ اس کا حاصل بجز طعن و تشنیع کے اور کچھ نہیں ہے۔ ابوالکلام نے کیا خوب کہا ہے:۔

"خواہ کچھ ہو ہم غصے، جوش اور محض جذبات کے ہیجان سے عملی دنیا کے مسائل حل نہیں کر سکتے"[6]

---

۱ غ ۔ خ ۔ م صفحہ ۶۱ ۲ خ ۔ غ م صفحہ ۶۱ ۳ خ ۔ غ ۔ م صفحہ ۶۱ ۴ مکاتیب اردوئے معلی صفحہ ۲۷ ۵ ام صفحہ ۳۴
۶ تبرکات آزاد صفحہ ۳۳۵

غصے میں سب سے پہلی بات جو انسان بھول جاتا ہے۔ یہی ہے۔

غالب سے کہیں زیادہ شدید مسائل اور سخت مراحل ابوالکلام کے سامنے تھے مخالفوں نے مخالفت دشمنی اور الزام تراشی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن وہ پورے صبر و ضبط سے اسے برداشت کرتے رہے۔ "بہرحال مجھے معلوم تھا کہ یہ دماغی بحران عارضی ہے بہت جلد اس چڑھاؤ کا اتار شروع ہو جائے گا پھر لوگ اپنے عقل و ہوش میں واپس آکر معاملہ فہمی کی استعداد پیدا کریں گے اور عجب نہیں وہی کہنے لگیں جو اس وقت میں کہہ رہا ہوں برسوں سے لوگوں کا یہی طرز عمل میرے ساتھ رہا ہے۔"[1]

کتنا فرق ہے ان دو دنیاؤں میں۔ جہاں ایک طرف طیش کا یہ عالم ہے کہ مغلظات غلط گالی دینے میں بھی تامل نہیں ''فیض'' غضب اور غصے کی کوئی حد نہیں اور دوسری طرف شعر

وہاں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

اس کڑی آزمائش میں اگر کوئی ابوالکلام کی طرح کامیاب ہے تو وہ سید احمد خاں ہیں۔ اس سید ملت نے اپنے کٹر مخالفین سے جس اعلیٰ سلوک کی مثال قائم کی وہ ان کی شایان شان ہے۔

حالی نے حیات جاوید میں ان کے کڑے مخالف اور کٹر معترض مولوی امداد العلی کا یہ واقعہ درج کیا ہے کہ انھیں حکومت سے تمغۂ ہند عطا ہوا۔ سید احمد خاں نے باوجود شدید مخالفت کے انکی اس خوشی میں اس طرح شرکت کی گویا یہ خوشی انہی کی خوشی ہے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں۔ "بلا تصنع آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم ما روشن دل ما شاد ان کا یہ زمانا کہ سید احمد خاں نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر اسٹار آف انڈیا لیا اور انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دیکر (میں بھول گیا ان کے مونچھ نہیں وہ اتباع سنت کے خیال سے مونچھ نہیں رکھتے تھے) داڑھی پر ہاتھ پھیر کر میرے سر اور آنکھوں پر۔ خدا کرے ایک ان کو اور ہزار مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔"[2]

اس چھوٹی سی مثال سے کہ آدمی میں حرص و حسد کا جذبہ کتنا ہے قدرتی اور قوی ہے مگر وہ اپنی شرافت اور شائستگی سے اس پر غالب آسکتا ہے۔ یہ تو فطری بات ہے کہ آدمی دوسروں سے امتیاز کی خاطر اپنی ذات کے لئے جو اعزاز چاہتا ہے۔ اس اعزاز میں دوسروں کی شرکت سے اس کا امتیاز کم ہو جاتا ہے اور وہ یہ پسند نہیں کرتا۔ پھر جب یہ اعزاز کسی مخالف کو ملے تو یہ بات اس کے لئے

---

[1] تبرکات آزاد صفحہ ۲۳۵ [2] ج ۲ صفحہ ۲۵۶ سمہ ۳

اور بھی ناگواری اور ندامت کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سے وہ کڑھتا اور چڑھتا ہے (شمالی ہند کی اردو کے محاورے کے مطابق کلستا ہے)، لیکن سید احمد خاں کا دل واقعی اتنا بڑا تھا کہ وہ اس بات سے کڑھے اور چڑھے بغیر خوشی خوشی اپنے جذبہ مسرت کا دل کھول کر اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار سے ان کے کردار ان کے وقار اور وقعت میں اضافہ ہوا۔ غالب اس بڑائی سے محروم رہے اور مخالفت کے جوش میں عام سطح پر اتر آئے جو ان کی شان اور شائستگی کے منافی تھی۔

کہاں ابوالکلام کا تمکنت اور سید احمد خاں کا ستائشی انداز اور کہاں غالب کی برہمی اور بیزاری کا یہ طرفہ تماشہ کہ غیاث اللغات کو حیض کا لتہ لکھتے ہوئے نہیں شرماتے۔

ابوالکلام کے ضبط اور خودداری کا حال ان کے رفیق اور معتمد خواجہ غلام السیدین کی شہادت کے مطابق یہ ہے "میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی برائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سنا کہ فلاں چھوٹے دل و دماغ کا آدمی ہے یعنی ان کی ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلت تھی"[۱]

ابوالکلام نے بھی اپنے مخالفین سے بحث و مباحثے کئے ہیں، لیکن یہ سب مزے کے خالص علمی نوعیت رکھتے ہیں غالب کو اگر اپنی فارسی دانی پر فخر تھا اور وہ اپنے ذوق خصوصی کو بطور سند کے لاتے تھے تو یہ جذبہ ہر طرح سے لائق تعریف، قابل تقلید ہے۔ مثلاً حزیں کے مطلع کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں "حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ...... زائد ہے اور بے ہودہ ہے متبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط نہیں ہے یہ سقم ہے یہ عیب ہے۔ اس کی پیروی کون کریگا۔ حزیں تو آدمی تھا۔ یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو" ایک جگہ کس توازن اور تنقیدی بصیرت سے لکھتے ہیں۔

"ایک سپاہی زادہ ہیچ مداں اور پھر دل افسردہ رواں زسودہ ہاں ایک طبع موزوں اور فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرواز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرح میں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش ہیں یا ان کا کلام وحی الٰہی ہے یا اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے"[۲]

غالب کا یہ طرز تنقید کتنا واضح اور کیسا وقیع ہے اور اس سے ان کا علمی وزن و وقار کتنا

۱۔ آجکل آزاد نمبر ص ۵۔ ۲۔ خ۔ غ۔ م ص ۱۷۷ بہ خطوط غالب ص ۲۳

نمایاں ہو جاتا ہے۔ غالب کا یہ طرز تنقید تو بہت اعلیٰ نہ سہی مگر بہر حال گوارا کیا جا سکتا ہے اور فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے۔ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کی موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کس تعریف کے شایاں شان ہیں نہ ترکیب نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متعلق نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں[۱]۔

غالب کو اس کا بھی حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے لئے کس کو سند قرار دیں اور کسے معیار تسلیم کریں۔ غالب جب یہ لکھتے ہیں تو ہم ان کی رائے سے چاہے اتفاق نہ کریں مگر انھیں ان کی اس رائے کا حق دیتے ہیں کہ وہ جسے چاہیں اپنا معیار مقرر کریں۔ اس سے ان کی انانیت پر کوئی حرف نہیں آتا اور ان کا یہ رویہ تنقید کی ترازو میں جانچا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما و متاخرین میں مثل صائب، کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو ان کا حال کیا گزارش کروں[۲]"

غالب کا یہ خیال بھی تاریخی صداقت اور تہذیبی واقعیت پر مبنی ہے کہ زبان فارسی مردے کا مال ہے۔ عرب کے ہاتھ بطریق یغما آیا ہے جس طرح چاہیں صرف کریں[۳]

غالب اگر روش عام اور تقلید و تتبع کے منکر تھے تو ہم انھیں اہل نظر میں شمار کر سکتے ہیں اور انہیں اس حد تک چھوٹ دے سکتے ہیں جب وہ یہ کہیں "یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے کیا آگے آدمی احمق نہیں پیدا ہوتے تھے؟"[۴]

لیکن غالب کی انانیت کا جو پہلو تنقید کی ترازو میں اپنے مخالفین کے رویے کے جواب میں ان کی شان و شائستگی کی سطح پہ پورا نہیں اترتا وہ ان کا وہ طرز تحریر ہے جس کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ یہ انداز ان کے اعلیٰ معیار کی چغلی کھاتا ہے یہ محض جذباتیت کا شکار ہے۔ غالب اگر اپنی فارسی دانی پہ فخر کرتے ہیں تو یہ بات کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جب اپنے جذبہ کا اظہار دوسرے اساتذہ پر طعن و تشنیع سے کرتے ہیں اور ان کو جلی کٹی سنا کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں تو یہ ذہنیت اور اس کی زبان تنقید کی دنیا میں کیسے نظر انداز کر دی جائے مثلاً اپنی فارسی دانی کے زعم میں ان کو کسی طرح اس کا حق نہیں پہنچتا کہ یہ طرز گفتگو اختیار کریں۔ "میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دیکر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جیسا

۱۔ خ۔ غ۔ م ص ۱۷۴ ۲۔ خ۔ غ۔ م ص ۱۰۸ ۳۔ خ۔ غ۔ م ص ۵۰۵ ۴۔ خ۔ غ۔ م ص ۱۰۹

وہ گھاگھس اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے اور یہ الّو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ اور ہمہ عالم کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو ایک زبان کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے فللّٰہ الحمد وللّٰہ الشکر[1]

مخالفین ان پر اعتراض کرتے ہیں تو غالب کا خیال ہے کہ وہ اس طرح اپنی ناموری کا سامان کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اوچھی پونجی والے گمنام اپنی شہرت کے لئے مجھ سے لڑتے ہیں۔ واہ واہ اپنی ناموری بنانے کو احمق بگڑتے ہیں[2]

وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خط ہے۔

رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہوگیا ہے باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے[3]

غالب نے دوسرے انانیت پسندوں کی طرح اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جو بلند معیار قائم کیا تھا اس سے ان کی بڑائی اور وقار کا اندازہ حالی کی اس رائے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مرزا نے اپنی کتاب مہر نیمروز میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کرکے ظاہر کیا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف ہیں شاید خودستائی اور تعلی پر محمول کریں گر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ مبالغہ نہیں کیا بالکل وہی کہا جو ان کے زمانے کے اہل نظر اور اہل تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے[4]

لیکن جب اور جہاں غالب اپنے مخالفین کا ذکر کرتے ہیں تو انانیت کا وقار برہم اور آہنگ بے سرہو جاتا ہے انھوں نے یہ ذکر ہر جگہ بزبان خداوندی کیا ہے لہٰذا یہ وعید خدا کے بعد غالب پر ختم ہے اور طنز و تشنیع میں ان کا کلام آتش دوزخ سے بڑھکر گرم ہے۔ ایک معلم فرومایہ۔ رام پور کا رہنے والا فارسی سے ناآشنا محض اور صرف و نحو میں ناتمام انشائے خلیفہ و منشآت مادھو رام کا پڑھنے والا چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے۔ یہ فارسی کیا جانیں ہاں طبع موزوں رکھتے تھے[5]

شہاب الدین کے خط میں ان کی انانیت کا رنگ اس شباب پر پہنچ گیا ہے کہ پناہ بخدا۔
بھائی شہاب الدین خاں خدا کے لئے تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کردیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں۔ خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دئے ہیں۔ دیوان جو چھاپے کا ہے۔ متن میں

۱۔ خطوط غالب مرتبہ مہر ص ۔۔۔ ۲۔ خ۔ غ۔ م ص ۱۲۳ ۳۔ خ۔ غ۔ م ص ۲۱۲ ۴۔ حالی ص ۵۲ ۵۔ خ۔ غ۔ م ص ۲۴۹

اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اگر حاشیہ پہ ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جائیں تو سمجھنا کسی ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر خرافات لکھ دیئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس عنصر کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟"

یہاں غالب کا اشتعال ادب کی حدوں سے گزر کر نا قابل برداشت بن جاتا ہے غلط اشعار ان سے منسوب کر دیئے گئے ہیں اور وہ اس پر بری طرح چراغ پا ہیں۔ اس کے برعکس ابو الکلام کے خلاف پنجاب کے کسی لیڈر نے یہ خبر نشر کر دی ہے کہ پنجاب میں کانگریس کی نشر و اشاعت کے لئے ورکنگ کمیٹی نے ڈاکٹر عالم کو ۲½ لاکھ روپیہ دیا ہے اور اس کار خیر کے لئے مولانا ابو الکلام پنجاب کا دورہ کریں گے۔ یہ ابو الکلام کے کردار اور ان کی دیانت پر اس درجہ سخت اور شدید الزام تھا کہ وہ اس پر جس قدر بھی تند و تیز لفظوں میں لعنت ملامت کرتے بجا تھا لیکن غالب کے شدید اور سخت طرز کلام کے مقابلے میں ابو الکلام کا یہ طرز نگارش باوجود غم و غصہ کے اس قدر رفعت و وقار کا معیار بن گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اور یہ رقم کن حضرات کے ذریعے بانٹی جائے گی، ڈاکٹر عالم کے ذریعہ؛ ڈاکٹر عالم تو رو رہا ہے کہ کانگریس میں مجھے کوئی پوچھتا نہیں اور یہ ۲½ لاکھ کی تھیلی اس کے حوالے کر رہے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ مولانا ابو الکلام پنجاب کا دورہ کریں گے۔ گویا مولانا ابو الکلام کو دین دنیا کا کوئی کام باقی نہ رہا۔ بجز اس کے کہ پنجاب کا دورہ کریں اور وہ بھی اس لئے کہ وہاں کے ایمان فروشوں میں ۲½ لاکھ کی خیرات تقسیم کر دی جائے۔ اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب الہلال نکلتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کس عالم بیان میں میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے۔ لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو یقین کے ساتھ پبلک میں اُسے بُرا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس سامنے آجاتا ہے میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو بُرا کیوں نہ کہوں اس سے زیادہ بُرائی کس میں ہوگی بہادر شاہ ظفر کا ایک سیدھا سادہ شعر ہے جس میں شعریت کی کوئی بات نہیں لیکن یہ سطر پر نقش ہو گیا ہے ؎

نہ تھی اپنی بُرائی پہ جب کہ نظر تو نظر میں بُرا تھا ہر ایک بشر

پڑی اپنی بُرائی پہ جب سے نظر تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ رہا

دیوانِ ظفر کے متعدد نسخوں میں میں نے یہ شعر تلاش کیا مگر یہ ہر جگہ ان لفظوں میں ملتا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی بُرائیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

غالب نے الفاظ کی بحث و تحقیق میں جو اسلوب اختیار کیا اس کا رنگ یکسر مناظرانہ تھا یا ملایانہ۔ ابوالکلام نے اس سے سختی سے اجتناب برتا ہے۔

غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں :۔

چونکہ آپ لکھتے ہیں کہ کسی وجہ سے انھوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کرلیا ہے۔ اس لئے براہ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجئے۔ میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔ ۱۹۱۶ء میں میں نے تین باتوں کا عہد کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا نہ شکایت سے اپنے نفس کو آسودہ ہونے دوں گا۔[۱۲]

کتنا نمایاں فرق ہے ان دو دنیاؤں میں۔ اقبال کی اصطلاح مستعار لی جائے تو کہنا پڑتا ہے سہ "کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور"

(بقیہ صفحہ ۱۰ سے آگے) اور پھر اس نے کہا :۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب نہ حیوانِ ظریف ہے اور نہ قنوطی، بلکہ وہ ایک عظیم شاعر ہے جو انسانی زندگی کے متعلق ہمہ گیر واقفیت رکھتا ہے۔

غالب جانتا ہے کہ عظیم شاعری کا مقصد کیا ہے ؛ شاعری کا مقصد محض خوش کرنا اور تعلیم دینا ہی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ شاعری کا مقصد ترسیلِ فکر اور جذبات کا اظہار ہے اور پڑھنے والے پر ایک ایسا اثر مرتب کرنا ہے جس سے وہ اپنے کو افضل سمجھے اور یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک نیا تجربہ حاصل کیا۔ غالب کی جدت طرازی، تخیل کی بلند پروازی، معنی آفرینی، جمالیاتی ویژن اور مشاہدے کی حیرت انگیز ہمہ گیری نے اس کی شاعری کو ایسی ہمہ رنگی تنوع، ابدیت اور آفاقیت عطا کی ہے جسے ہر زمانہ میں ہر زبان، فطرت اور ذوق کے لوگ پسند کرتے رہے اور پسند کرتے رہیں گے۔

بشیر بدر

خطوطِ غالبؔ کی

"سوانحی، تاریخی اور ادبی حیثیت"

خطوط کی سوانحی اہمیت بتاتے ہوئے LONGAKER اپنی تصنیف ENGLISH BIOGRAPHY OF 18TH CENTURY میں لکھتا ہے:—

خطوط کے ذریعہ انسانی فطرت کی ان سرحدوں میں بے دھڑک داخل ہو سکتے ہیں جن میں سوانح عمری اور آپ بیتی کو اذنِ باریابی نہیں ملتا۔

ہمارے یہاں مغرب کے مقابلے میں جو اچھی سوانح عمریاں نہیں لکھی جا سکیں اُن کی صرف یہ وجہ ہے کہ ہمارے یہاں سوانح عمری کا وہ تصور پروان نہیں چڑھ سکا جس کے بغیر ایک اچھی سوانح عمری کا لکھا جانا مشکل ہے۔ حالی اور شبلی کی سوانح نگاری کی بنیادی کمی یہ ہے کہ وہ گناہ و ثواب سے بھرپور انسان کو پیش کرنے کے بجائے اس کے کارناموں اور فتوحات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھیں نجی بے تکلف خطوط کی ضرورت کم پڑتی ہے۔ ان کے کام کی وہ تحریریں ہیں جو مشاہیر مشاہیر کو لکھتے ہیں جو اگر خط کی صورت میں بھی ہوں تو علم اور منصب کے تصور سے خط نہیں رہ جاتیں بلکہ وہ خط علمیت یا ادبیت کا اظہار ہو جاتے ہیں جن کی اپنی اہمیت ہے لیکن یہ خط تمام تحریریں ہیں اُس انسان سے نہیں ملاتیں جو اپنی ساری شہرت اور حاصل کی ہوئی علمیت کو ذرا بھول کر اپنے محبوب کو چاہنے، چاہے جانے کی آرزو کرتا ہے، دوستوں سے دوستانہ محبت اور لڑائیاں کرتا ہے۔ جس کے سطروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے پیچھے بھی ایک انسان کی ضرورت امید ناامیدی، آرزو، تمنا، غم، ناراضگی اور محبت جھلکتی ہو۔ دراصل ایسے ہی نجی خطوط کسی کی سوانح نگاری میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان ایسے نجی خطوط میں جن کی تشہیر اور اشاعت کا خدشہ نہ ہو، بے نقاب ہو سکتا ہے۔ ایک بڑے ادیب کا کسی بڑے ادیب۔ ادارے کے نام خط علمی یا ادبی حیثیت سے اہم چیز ہو سکتی ہے۔ لیکن نجی سوانح عمری کے لئے وہ کم مفید ہے۔

غالبؔ کے اردو خطوط سوانحی حیثیت سے اہم ہیں، لیکن بدقسمتی سے یہ سلسلہ غالب نے بہت دیر میں شروع کیا۔ غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۱۸۴۸ء تک ۔ ۔ ۔ وہ بھی فارسی ہی میں

خط و کتابت کرتے رہے جیسا کہ حالی کا خیال ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہوگئے اس وقت بضرورت اُن کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی .... اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اردو میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔

غلام رسول مہر کو حالی کی اس رائے سے اختلاف ہے لیکن اس کی دلیل میں کوئی اٹل ثبوت وہ بھی نہیں پیش کرسکے۔ مولانا امتیاز علی عرشی "مکاتیب غالب" میں غلام رسول مہر سے اختلاف کرتے ہیں اور تقریباً حالی کی تائید کرتے ہیں، ایک دو سال کا فرق بتاتے ہیں۔

میں یہاں صرف اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ غالب نے اردو خطوط اس وقت لکھنے شروع کئے جب اُن کے سفر زندگی کا بہت بڑا اور بہت خوبصورت اور ہنگامہ خیز حصہ تمام ہوچکا تھا مثلاً:۔ امراؤ بیگم سے شادی ہوئی (۹ اگست ۱۸۱۰ء) کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے (۱۸۲۷ء) لکھنؤ دیکھا (۲۷ جون ۱۸۲۸ء) کلکتہ پہنچے، وہاں کیا کیا گذری، کیا کیا دیکھا (اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے) دلّی واپس آئے اردو دیوان کی اشاعت ہوئی (۱۸۴۱ء) دہلی کالج کی اُستادی سے انکار کیا ۱۸۴۲ء، قمار بازی میں گرفتار ہوئے (۱۸۴۷ء) تین ماہ قید کاٹی۔ ۱۸۵۰ء میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس لئے اُردو خطوط بھی اُن کی مکمل سوانح عمری لکھنے میں بہت زیادہ مدد نہیں دے سکتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سوانح عمری صرف واقعات اور حالات کی دستاویز نہیں ہے بلکہ حقائق کی افسانویت ہے۔ جس طرح افسانہ واقعات اور حادثات کی کھتونی نہیں ہوتا بلکہ اُس میں صرف اس واقعے، حادثے بلکہ کبھی کبھی ایک جملے اور فقرے کی کلیدی اہمیت ہوتی ہے اس لئے سوانح عمری میں جس کی حیات لکھی جاتی ہے اس کے کردار، ذہن اور مزاج کا ارتقا اور جذباتی تشکیل دکھانی پڑتی ہے۔ ایک پچاس سال کا تجربہ کار انسان جذباتی مرحلوں میں جس عقلیت توازن سے گذرتا ہے، یا جس جذباتیت اور بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی تشکیل گذشتہ پچاس سالوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے اس میں شک ہے کہ صرف اردو خطوط کے سہارے غالب کی اچھی اور سچی سوانح عمری لکھی جاسکتی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ غالب پرستی کے اس مناسب موسم میں ضرور اس کی کوشش کی جاتی۔ یہاں کسی چیز کی اہمیت کم کرنا منظور نہیں ہے بلکہ عرض واقعہ ہے۔

پھر ایک نکتہ اور بھی غور طلب ہے کہ چند سال بعد ہی مرزا غالب ہی کو نہیں بلکہ ان کے قریبی حلقے میں یہ بات واضح ہوگئی تھی۔ یہ خطوط کسی کی نجی ملکیت ہیں اور ان کی ادبیت کا تقاضہ ہے کہ ان کی اشاعت ہو

اور یقیناً اس کے بعد غالب نے جو خطوط لکھے ہیں اُن میں شعوری احتیاط ضرور کارفرما ہوگی۔ لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مرزا غالب واقعی اس وقت آشنائے سرد و گرم زمانہ دیکھے چکے تھے کہ اُن کی وسیع النظری میں اعتراف گناہ تقریباً ایک فرمایہ چیز بن چکا تھا۔ وہ انسانی جذبات اور خواہشات کے فطری اظہار میں کسی پردے کو عام طور پر حارج نہیں ہونے دیتے تھے۔ عام طور پر اُن کے خطوط میں اُن کی زندگی، خواہشات، مطالبات، جذبات اور آرزوئیں بے نقاب ہیں۔ یہ اس وجہ سے بھی کہ خطوط جن ضرورتوں کے لئے لکھے جاتے تھے اُن میں اپنے مقصد کا اظہار کرنا ضروری ہوتا ہے دوسرے مرزا غالب کے یہاں زندگی کا تصور، اخلاق اور مذہب کی رسمی حدبندیوں سے کہیں وسیع تر ہے۔

غالب کے خطوط کے دو مجموعے (عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ) اُن کی زندگی میں پریس پہنچ چکے تھے عودِ ہندی ۲۷/ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا۔ لیکن اس کی اشاعت کا تصور برسوں پہلے غالب کے دوستوں اور شاگردوں کے ذہن میں تھا۔ ۱۶/ نومبر ۱۸۵۸ء کو غالب نے منشی شیو نرائن کو جو خط لکھا وہ اس طرح ہے۔

"اردو کے رقعات جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رقعہ
ایسا نہ ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر
سرسری ہے اوس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے، اس سے
قطع نظر کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ
کہ اِن رقعات کا چھاپا جانا میرے خلاف طبع ہے۔"

غالب کی یہ تحریر بہت اہم ہے۔ یہ واضح ثبوت ہے کہ غالب کے ذہن میں اس سے قبل یہ بات قطعی نہیں تھی کہ ان خطوط کی اشاعت بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو لکھتے وقت کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اور بقول ان کے "قلم سنبھال کر اور دل لگا کر" نہیں لکھا۔ دوسری بات اس سے اہم ہے کہ وہ بھی معاملات جن میں کوئی تکلف اور پردہ نہیں رکھا گیا ہے، دنیا کے سامنے کیوں آئیں۔ یہ دونوں بنیادی کمزوریاں "فطری خطوں کی" بنیادی خوبیاں ہیں" مجھے اس بات پر زیادہ افسوس نہیں ہے کہ غالب کو ۱۸۵۷ء میں شعوری طور پر کیوں محتاط کرا دیا گیا بلکہ اس کا زیادہ ملال ہے کہ حالات نے غالب سے تیس چالیس سال قبل ہی کیوں اردو میں خطوط نہ لکھوائے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہ ہوتی۔ غالب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچ گئے تھے، کافی عرصے تک رہے۔ فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے اردو کی جدید نثر کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے اردو کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دے دیا تھا۔ کلکتہ کے سفر سے غالب کے مالی نقصانات اور زیادہ ہوئے مگر بقول شیخ اکرام "مرزا کے مشاہدہ کی وسعت اور ذہنی نشوونما کے لئے کلکتہ کا سفر مفید رہا" مگر غالب ۱۸۵۰ء سے پہلے اردو میں خط نہ لکھ سکے اسکی تہ میں "پارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ" والی انا کے ساتھ ساتھ طبقہ شرفا امرا کا دستور بھی حارج رہا ہوگا اسلئے کہ غالب اپنی شاعرانہ شہرت کے برابر اگر کوئی چیز

عزیز رکھتے تھے تو یہی وضع نوابانہ اور خطابات خسروانہ — اس وجہ سے انھیں اپنی اس قوت "کا عرفان ذرا دیر میں ہوا۔ ان خطوط میں ایسے حالات بھی ہیں جو سوانحی کہے جا سکتے ہیں وہ اسلئے کہ غالب خطوں کو کم از کم (۱۸۵۸) تک بغیر تشہیر و اشاعت کے خوف کے لکھتے ہیں۔ ان خطوط کی سوانحی اہمیت بھی ہے لیکن میں بنیادی بات کی طرف اشارہ پہلے کرنا چاہتا تھا کہ ان خطوط کی بنیاد پر سچی سوانح نہیں لکھی جا سکتی اسلئے کہ یہ اس دور کا اظہار نہیں ہیں جب کردار ارتقائی مراحل سے گذر تا ہے اور یہ ارتقا جب اپنی تکمیل کو تقریباً پہنچ جاتی ہے اس وقت ایک انسان کے لئے دنیا اور اس کے اہم ترین جذباتی حادثات "بازیچہ اطفال" ہو جاتے ہیں۔

ایک عام قاری کے لئے غالب کے خطوط کے پیچھے جو غالب کی متوازن، تجربہ کار، شگفتہ، اور غمگین جذبوں کی پیچیدہ شخصیت ہے اس سے پوری واقفیت میں ضرور دقت ہوگی وہ اسلئے کہ اگر نوجوان غالب، جوان غالب اور ادھیڑ غالب کے خطوط پڑھنے کے بعد ان خطوط کو پڑھا جاتا تو ہر لفظ کے پیچھے جو شخصیت کی تہہ داری ہے وہ اور زیادہ نمایاں نظر آتی۔ حادثات زندگی اور تجربات زمانہ نے غالب کو سنہ ۱۸۵۰ء تک وہ تجربہ کاری اور پختگی دے دی تھی کہ ان کی جذباتی زندگی کا جذباتی لمحہ بھی اب (EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUILITY) کی سنجیدگی سے آگے نکل گیا ہے۔ بڑی بات ہے کہ غالب نے اس عمر میں شگفتہ اور شوخ انداز برقرار رکھا ہے۔ جب سوگوارانہ جھلاہٹ بھی عیب نہیں ہوتی۔ غالب کی یہی زندگی آمیزی ان کے خطوط کی جان ہے لیکن جذباتیت کا جو اعتراف اور اقرار، اعلیٰ ادب میں عیب ہو سکتا ہے۔ خطوط میں سوانحی حیثیت سے بہت اہم ہوتا ہے۔ تجربہ کار فرد سے بچپن اور نوجوانی کے سیدھے اور سچے جذباتی تجربوں کا اقرار! ان خطوط میں ڈھونڈھنا زیادتی ہے۔ مثلاً مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ کی وفات پر جو تعزیتی خط لکھتے ہیں۔ اس میں یاد کی ایک تیز لہر مرزا کو ذرا سا ہلا کر رہ جاتی ہے بس اتنا ہی لکھتے ہیں

"... میں مغل بچہ ہوں" عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو..."

غالب کی عظمت اس فقرے میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنے مرحوم محبوب کا بڑھاپے میں ذکر اسی سنجیدگی اور سنجیدہ شوخی سے کر کے گذر جانے میں عافیت ہے، لیکن کیا ایسا بیان اس سال ممکن ہو سکتا تھا جب واقعی ان کی محبوبہ کا انتقال ہوا تھا۔ اس مختصر اشارے سے سوائے قیاسی داستاں سرائی کے کوئی سوانحی حقیقت مرتب نہیں ہوتی۔

اسی طرح حاتم علی بیگ کو ان کی تصویر پانے پر جو خط لکھا گیا ہے اس میں بھی "یاد ایام" والی کیفیت ہے اور اس میں جذباتیت کی لہر ذرا تیز ہو گئی! اور مرزا اپنی جوانی کی شبیہہ کو دیکھنے لگے ہیں۔

"... میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے، تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ"

رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا میرا رنگ چمپئی اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے اب بھی جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ پھر جاتا ہے...... جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔۔"

سوانحی اہمیت کے لحاظ سے یہ خط اہم ہے۔ اب یہ سوانح نگار کا اپنا کام ہے کہ اس بیان کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی کرے۔

وقت کے اسی فاصلے کی وجہ سے غالب کے نجی اور سوانحی حالات پر آتنا پردہ ہے، جن باتوں کو وہ اکثر بیان کرتے ہیں۔ اُن کی اصلیت" پر غالب کی پہلو دار شخصیت، کی ایسی پرچھایاں پڑتی ہیں کہ اصل واقعہ تک رسائی میں اختلاف ضرور رہ جاتا ہے۔

خاص طور پر غالب اور بیگم غالب کے تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ غالب اور ان کی بیگم کے تعلقات بہت کشیدہ بتاتے ہیں وہ بھی انھیں خطوط کو حوالے میں پیش کرتے ہیں اور جو لوگ غالب اور ان کی بیوی کے تعلقات کو نارمل بتاتے ہیں وہ بھی انہیں خطوط کے انھیں جملوں اور فقروں کو ثبوت بناتے ہیں۔ در اصل عمر کے تجربے نے غالب کی شخصیت کی جو تعمیر و تشکیل کر دی ہے وہاں ہر چیز مرکب (COMPLEX) ہے۔ اسلئے ایسے علامتی اظہار کی بنا پر یہ فیصلہ کر دینا کہ غالب کے اور ان کی بیگم کے تعلقات جوانی ہی سے کشیدہ تھے' زیادتی ہے۔ غالب کے چند بیانات ملاحظہ ہوں۔

"...... ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا، ایک بیڑی پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔"

اکثر مضامین نگار حضرات (جن میں علم نفسیات کے اُستاد' غالب کے شیدا جناب معز علی بیگ بھی شامل ہیں) اُن کے اس فقرے (شادی کو) حکم دوام حبس" سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مرزا اس شادی سے سخت عاجز رہے لیکن اگر اس علامتی تحریر کو اقرارِ واقعی سمجھا جائے تو کچھ اور نتائج نکلتے ہیں مثلاً

شادی سے پہلے کی زندگی	حوالات
شہر دلی	زنداں

نکر نظم و نثر (زنداں کی) مشقت

اور پورا نتیجہ یوں نکالنا چاہیے کہ غالب کے لئے زندگی حوالات کی قید، حبس دوام کی سزا دی قید خانہ، شاعری چکی پیسنا تھی۔ دراصل یہ نتیجہ خیزی مضحکہ خیز ہوگی۔ لیکن بیوی ایک قیامت والے نظریے کو تقویت اور چند تحریروں سے ملتی ہے۔ امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کی موت کی خبر پا کر تفتہ کو لکھتے ہیں:

"...... امراؤ سنگھ کے حال پر اس واسطے مجھکو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔"

یہاں پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ غالب کی تجربہ کار انسانیت، امراؤ سنگھ کا غم غلط کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح غدر کے دو برس بعد دلی میں سخت ہیضہ کا دورہ ہوا۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"...... وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ، ایک ۶۶ برس کا بڈھا اور چونسٹھ برس کی بڑھیا۔ ان دونوں میں سے ایک مرتا تو ہم جانتے کہ وبا تھی۔ تف بریں وبا۔"

یہاں بھی حالات، بڑھاپے اور صدمات کی وہ تیز رو ہے جو موت مانگتی ہے۔ یہاں صرف بیوی کو نہیں کوسا جا رہا ہے بلکہ ۶۶ برس کے بڈھے (غالب) کو بھی مرنے کی دعا دی جا رہی ہے۔

اس طرح ان خطوط کی سوانحی اہمیت ثانوی ہے۔ ان خطوط کی عظمت اور اہمیت یہ ہے کہ پورا غالب، موقع پر اس کی متوازن انسانیت، اس کا علامتی اور ادبی اظہار، ایک انسانی بصیرت اور ادبی مسرت عطا کرتے ہیں۔ ان خطوط کے ادبی، علامتی، شاعرانہ اور شوخ اظہار پر سوانح کی بنیاد رکھنا ہمیشہ اختلافی مسئلہ ہوگا۔ ایسے اختلافی خطوط کے علاوہ ایسے واضح خطوط بھی ہیں جو اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ سوانح میں بھی مدد کر سکتے ہیں مگر میری بات کی یہ خطوط اور تصدیق کرتے ہیں کہ ان کی قابل یقین وضاحت اس لئے ہے کہ وہ ان میں وقت کا طویل فاصلہ نہیں ہے۔ مثلاً میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:۔

"..... خط لکھ کر اور بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کھاؤں گا۔ پھر بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا......"

اس بیان میں غالب کی متحرک شخصیت محسوس ہوتی ہے۔ اس میں ذہانت، علم اور تجربہ کی

عظمت سے زیادہ ایک عمر رسیدہ انسان کی معصومیت ہے۔ اس کا روزانہ کا معمول ہے

"مجھے بھرپور طرح یہ بات یاد آرہی ہے کہ کاش مرزا اردو میں ایسا ہی معصوم خط اپنے عہد جوانی میں لکھتے جس میں کچھ اس طرح کا انداز ہوتا۔ شام آئے گی۔ اُس کی گلی جاؤں گا۔ اس سے چاندنی رات میں اپنی وہ غزل سنوں گا جو مجھے خوب معلوم ہوتی ہے اور دنیا کو......"

کلکتے سے اپنے شاگردوں کو جب خط لکھتے تھے تو انھیں تاکید کرتے ہیں کہ امراؤ بیگم صاحبہ کو ان کا خط ضرور سنایا جائے مثلاً:-

"تم میرے گھر کی ڈیوڑھی جاؤ اور اپنی ستانی (بیگم غالب) کو یہ خط سنا دو اور کہہ دو کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے"۔

واضح ہو کہ یہ اُسی غالب کا خط ہے جو کلکتے میں کام ہوگا یا نہ ہوگا کی کشمکش میں مبتلا تھا مگر اپنی بیگم کو لکھتا ہے کہ کہہ دو کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔

اس طرح غالب کے خطوط کے مطالعہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جو سوانحی حیثیت سے مفید اور قابل اعتبار ہیں لیکن اُن میں بیشتر وہ واقعات اور معمولات ہوں گے جو اس دور سے متعلق ہونگے جہاں بچپن اور جوانی کی یادوں کی باز آفرینی ہے ان پر خط لکھتے وقت کوئی تجربہ، مقصد اور وقت کا طویل فاصلہ حائل ہے۔ اس لئے ایسے خطوط کی "سوانحی اصلیت" ہمیشہ اختلافی رہے گی۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

غالب کے خطوط سے "تاریخ" مرتب کرنے کی کوشش جو حضرات کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر غالب کے خطوط "تاریخی دستاویز" ہوتے تو وہ غالب کے خطوط ہی نہ ہوتے۔ غدر کے بعد مرزا کے انگریز حاکموں کو خط اور قصیدے۔ بعض انتہا پسند ادیبوں کی نظر میں مرزا کی بہت خود غرض تصویر بناتے ہیں۔ اس میں مرزا کا قصور نہیں، قصور در اصل اس انتہا پسندی کا ہے جو کسی کے فعل کو اس کی مکمل شخصیت، ماحول اور حالات کے ساتھ دیکھنے کے بجائے، الگ سے اور اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ میں اُن تمام خطوط کا جن میں اعزاز و اکرام پانے کی تمنا ہے، صاحبان فرنگ کی شان میں قصیدہ بھیجنے کی اطلاع ہے، دربار میں بلائے جانے کی تمنا ہے، اُن کی اصلیت کوئی نفسیاتی، معاشرتی یا مالی جواز اس مختصر مضمون میں پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن غالب کی فطرت کو سمجھنے کے لئے ان کا یہ شعر ذہن میں رکھنا ضروری ہے ؎

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

وہ اپنی عشقیہ زندگی اور مرحوم محبوبہ کا انداز جس اختصار اور ضبط سے کر جاتے ہیں وہ ثابت

کرتا ہے کہ غالبؔ ماضی کے بڑے سے بڑے غم کو حال کے اندیشے کے مقابلے میں کم تر سمجھتے ہیں۔ یہ تری عصبیت ہی نہیں بہت سے مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود اپنے مصائب بھی بھول جاتے ہیں۔ دوسروں کے دُکھ میں دیوانہ بنکر زیادہ دن مجنوں نہیں بن سکتے۔ اس لیئے جو شخص اپنی عزیز محبوبہ کی موت کا ذکر، ایک عرصے کے بعد ٹھٹھول کے ساتھ بیان کرتا ہے، اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نئے حاکموں سے جن سے بے شک اس کی حالیہ اُمیدیں وابستہ ہیں اُن سے نفرت کرتا رہے اور اپنے قدیم کرم فرماؤں کا شعر و نثر میں نوحہ لکھتا رہے۔ اس لئے جب غالب کی تحریر میں، ماضی کے غم کی لکیر نظر آئے تو اُسے بہت گہرا دار سمجھئے۔ غالبؔ کی شخصیت، ان کا ماضی کی ناکامیوں سے رویہ، حال کی امیدوں سے وابستگی کا اندازہ کیجئے بغیر ہم کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیئے کہ غالب کے خطوط، خطوط ہیں، جن میں غالب کے جذبات، کیفیات کے آئینے میں اُن کا عصر نظر آسکتا ہے۔ اُن کے خطوط، تاریخ نہیں جس میں ان کا وجود خارج (DETACHED) ہو جائے اور تاریخی اور عصری واقعات بے کم و کاست بیان ہو جائیں۔

خطوط کو تاریخ نہ سمجھ کر جب ہم دیکھیں تو غالب کی ان تحریروں میں غالب بھی نظر آئینگے اور ان کا دور بھی۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"......... ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ پہلے جنم کی ہے ...."

"...... میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی ہے اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر، کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہندو البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں ...."

"........ مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے، وہ نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں بمفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں ......"

یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا تم زنہار یہاں کا

ارادہ نہ کرنا ابھی دیکھا چاہیئے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں"

غالب کا یہ خط اس حد تک جذبے کی گرفت میں ہے کہ غالب کی جس عقلیت پسندی اور مصلحت کوشی اور دنیاداری کا اس کے موافقین بھی چرچا کرتے ہیں وہ بھی اس خط میں نظر نہیں پڑتی" دنیا کا جن لوگوں کو براہ راست تجربہ ہے یا جن کا تخیل اتنا رسا ہے کہ وہ اس دور کے انگریزی جبر کا ذرا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انھیں غالب کا یہ خط "غیر دانشمندانہ" معلوم ہونا چاہیئے۔ آج جب قانونی حیثیت سے ہم جمہوری ملک کے آزاد شہری ہیں اس وقت بھی جب ہم اپنے کسی پڑوسی ملک میں رہنے والے فرد یا اخبار کے مدیر کو خط لکھتے ہیں تو ہماری ہمت نہیں ہو سکتی کہ اپنے ملک کے حقائق کی مثبت نظریے اور مقصد کے لئے پیش کر سکیں اندازہ کیجیے اس دور میں جہاں کسی کے ذرا سے جھوٹے اشارے پر خاندان کے خاندان سربازار قتل کر دیئے جاتے تھے وہاں خط میں یہ لکھنا کہ:-

(۱) ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا

(۲) گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک بھی پنجشنبہ دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔

(۳) سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔

(۴) مفصل حال لکھتے ڈرتا ہوں۔

دراصل غم، بربادی، خوف، اور اظہار حق ایسی تصویر ہے جس میں مصلحت اور عقل بھی حارج نہ ہو سکی اب بھی شدت غم دو سال بعد بھی اسی بے باکی اور جنون کے ساتھ دُہرا رہی رہے تو غالب کی شخصیت اس مزاج سے کوسوں دور تھی۔ اگر غالب کو اسکی اجازت بھی ہوتی تو بھی اس شدت غم اور تحمل سے وہ اپنے غموں کا بیان بار بار نہ کرتے اس بات کی وضاحت میں اُن کی ذاتی زندگی کے حادثوں سے کر چکا ہوں کہ وقت، اُن کی فطری شوخی، حاصل کی ہوئی چیزوں سے لذت کوشی نہ ملنے والی چیزوں کی طلب اُن کے جذبات اور احساسات کو ماضی کے غموں میں بہت دیر تک اسیر نہیں رہنے دیتی۔ زخم بھر جاتا ہے۔ زخم کا ایک نشان رہ جاتا ہے۔

۱۸۶۰ء میں انوار الدولہ شفق کو جب تباہی دلی" کا احوال لکھتے ہیں تو یہ غم بھرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس غم کے ساتھ اُن کی فطرت عقلیت، حالات کا تجزیہ، شوخی اور زندگی عود کر آئی ہیں۔ مجموعی اثر اس خط کا بھی غمگین ہے لیکن تفتہ والے خط اور اس خط میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق کسی مصلحت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ غالب کے خطوط بیان واقعہ، اور سرگذشت حادثہ سے زیادہ خود ان کی شخصیت کا اظہار ہیں۔ لکھتے ہیں :-

"........ پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پہ ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا (یہ بات جھوٹ نہیں ہے اور غدر کی ناکامیابی کی یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے والے خود منظم نہ تھے انھوں نے اہل شہر سے وہ سلوک نہیں کیا جو اہل وطن سے مجاہدین وطن کرتے ہیں بلکہ اُن کے برتاؤ میں غرور رعونت تھی اور لوٹ مار کا سا انداز تھا) دوسرا لشکر خاکیوں کا اوس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمیں و آثار ہستی سراسر لٹ گئے، تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوک سے مرے چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا اوس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی ...."

غالبؔ کے خطوط کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ وہ ایک بڑے شاعر اور بڑے ادیب کے ذاتی خطوط ہیں اُن خطوط کا سوانحی یا تاریخی اہمیت کا ہونا خطوط کی تنقید میں اہمیت رکھتے ہوئے بھی ثانوی بات ہیں۔ غالبؔ کے خطوط کی ادبیت ہی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔ ادبیت کیا ہے، یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک آسان تاثراتی جواب یہ ہوتا ہے کہ کسی تحریر میں اُس کی تکمیل (PERFECTION) کو ادبیت کہہ سکتے ہیں۔ میں شروع سے یہ بات واضح کرنا چاہ رہا ہوں کہ غالبؔ کے خطوں کو کسی اور بے ساکھی کی ضرورت نہیں ہے اُن خطوں کی سوانحی اہمیت ہے یا نہیں، اُن میں اُس کی تاریخی اصلیت ہے یا نہیں، اُن خطوں میں کسی طبقے کے رسم و رواج کا بیان ہے یا نہیں بالکل ثانوی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اس لئے کہ غالبؔ کے خطوط اِن صفات اور اِن کے علاوہ اور دیگر رنگوں کی اکائی میں ان کی اہمیت یہ ہے کہ اُن خطوں میں غالبؔ اور اس وقت کا غالبؔ جس وقت ان کو لکھا گیا ہے اپنے تمام جذبوں کے ساتھ ہمیں محسوس ہوتا ہے، غالبؔ کے خطوط کی کچھ ادبی خوبیاں اس طرح بیان کی جاتی ہیں:۔

(۱) مراسلہ کو مکالمہ بنانا۔ یہ مرزا کا خود دعویٰ (CLAIM) ہے، میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

بھائی، مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔

مکتوب الیہ سے مکالماتی انداز میں اتنا قریب ہونا کہ اُسے غائب تصور کر کے، اُس سے اُسی کی

باتیں کرنے لگنا مرزا کے خطوط کا ایک انداز ہے۔ میر مہدی کے اندازِ نگارش کی تعریف کرتے ہوئے انھیں کو لکھتے ہیں :۔

> "...... ستودن کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔

میر مہدی کچھ عرصے پانی پت میں انصاریوں کے محلے میں رہے تھے۔
غالب کے خطوط میں کہیں کہیں خود کلامی آجاتی ہے۔ مثلاً انورالدین شفق کو لکھتے ہیں :۔

> کیوں کر کہوں میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم، من غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت صاحب نہ بن، اے ایاز، حد خود بشناس، مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نوبت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے۔ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خیر پوچھ، پھر عنایت نامے کا شکریہ ادا کر۔

غالب کو جدید نثر میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ اور مرزا جدید نثر کی اہمیت سے واقف ہو گئے تھے اسی لئے انھوں نے خطوط میں اسلوب کی نیرنگیاں پیدا کیں مراسلے کو مکالمہ بنایا، مکتوب الیہ کو غائب فرض کر کے اسی سے گفتگو کی، خود کلامی سے متاثر کیا مگر زبان گفتگو کی صاف سادہ اور سلیس رکھی۔ ان کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ مقفیٰ اور مسجع عبارت اب صرف ہنسنے ہنسانے کی چیز ہے۔ جب بھی ہم کوئی دل کی بات کہیں یا بیان واقعہ ہو ہمیں صاف اور سادہ نثر میں اظہار کرنا پڑے گا۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت میں ان کے جو خط ہیں ان میں تقریباً مزاج کا وہی انداز ہے جیسے ہماری نظموں میں کتابی ہندی کا استعمال محض ٹھٹھول اور دل لگی کے لئے کیا جاتا ہے۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں :۔

> " آؤ میاں سید زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنوں کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش،

نہ سخنوری نہ سخندانی، کس برتے پر تتا پانی، ہائے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

دراصل اس عرض حال سے جو سنجیدگی پیدا ہوتی ہے اُسے غالب قافیہ کی مسکراہٹ سے معتدل کرنا چاہتے ہیں۔ مرزا کے خطوط کی ادبی حیثیت ایک یہ بھی ہے کہ اُن کے خطا خطا رہتے ہوئے بھی شعر و ادب کے بہت سے مسائل حل کر جاتے ہیں۔ مرزا کے خطوط اُن کا نظریہ شعر و ادب تنقیدی نظر اور بصیرت فن کیلئے غور و فکر جگر سوزی اور اچھی اور خراب شاعری کے نکات کے لئے اہم اشارے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں اُن تمام خطوط کے حوالے نہیں دیئے جاسکتے لیکن چند اشارے بات کی وضاحت کیلئے ضروری ہیں۔

۱۔ شاعری، رعایت لفظی کا کرتب نہیں ہے۔

"اسد اور شیر، بت اور خدا، جفا اور وفا یہ میری طرز گفتار نہیں"

متروکات سے پرہیز | تیئس کا لفظ متروک ہے اور مردود و تبیع غیر فصیح، یہ پنجاب کی بولی ہے مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہمارے ہاں نوکر رہی تھی وہ تیئس برتی تھی تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پہ ہنستی تھیں۔

شاعری | بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے"

اس طرح کے نکات شاعری اُن کے خطوط سے، اور اُن کی اصلاحوں سے جمع کر سکتے ہیں جو اُن کے خطوط میں "ادبیت" کا اضافہ کرتے ہیں۔

اس مختصر مطالعے سے یہ چند باتیں واضح ہوتی ہیں کہ غالب کے خطوط میں علم، ادب، شعر، زندگی کے مسائل، ماضی کی یادیں اور مستقبل کی فکر، اکائی کی صورت میں ملتی ہیں۔ اُن کے اسلوب میں جو مکالماتی اور خود کلامی انداز ہیں وہ صرف جدت اسلوب نہیں بلکہ اس انجمن آرائی کے پیچھے کوئی راز ہے۔ غالب کے بہت دوست، مداح اور شاگرد ہیں لیکن بقول پروفیسر آل احمد سرور "غالب کے خطوط میں وہ آدمی نظر آتا ہے جو اس فکر کی وجہ سے تنہا محسوس کرتا ہے اور اس تنہائی کو دور کرنے کے لئے اپنے گرد ایک انجمن بنا لیتا ہے"۔ دراصل یہی احساس تنہائی ہے جو اُن کے خطوط کے مکالماتی ہونے کا بھی راز ہے دوسری بات کی طرف بھی پروفیسر صاحب ہی کا اشارہ ہے کہ غالب کی "پرواز فکر" ہی اُن کی تنہائی کا سبب ہے غالب کے خطوط اُن کی شخصیت کا پُرخلوص اظہار ہیں۔ اس پُرخلوص اظہار کو غالب کی بصیرت نے

---

(۱) علیگڈھ میگزین غالب نمبر ۹ م ص ۹

جو اسلوب دیا وہ فطری طور پر مناسبت رکھتا تھا۔ غالب نے نثر کی نثریت اور اس کی قوت کو پہچان کر اس سے پورا پورا کام لیا۔

غالب کے خطوط کی ادبیت کے بارے میں بجا طور پر تعریف و تحسین کی گئی ہے اُردو نثر میں غالب کے خطوط کی تاریخ ساز حیثیت ہے ایک بڑے شاعر کا اپنے ہم عصروں سے اردو میں خط و کتابت کرنا اور اسے فن بنا دینا بذاتِ خود ایک اہم قدم ہے۔

ان خطوط کی ادبیت مسلّم ہے۔ یہ خطوط' اچھے خطوں کی مثال ہیں۔ بس میں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عمر رسیدہ' تجربہ کار غالب کے فطری سچے اور شگفتہ خطوط ہیں' بنیادی بات ہمیں نہ بھولنی چاہیے کہ غالب نے اِن خطوط کو ۵۰ سال کی عمر کے بعد لکھا جب اُن کی ذہنی تشکیل پختہ ہو چکی تھی' اور جوانی کی یادیں دھندلا گئی تھیں۔ اسلیئے پہلی بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت جو اُن کے ذاتی حالات اُس دور کے ماحول اور اُن کی نثری اور شعری تخلیقات کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے اس کا مطالعہ کئے بغیر ہم غالب کے خطوط کی ساری اصلیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی شخصیت سے واقفیت کے بعد ان کے بیانات سے اُن کے عصری حادثات اور واقعات کو سمجھنا ناممکن نہیں لیکن اِن خطوں میں بیان کئے گئے ایسے واقعات جن کو گزرے ہوئے زمانہ گذر چکا ہے اور جن کی جذباتی شدت اپنی تفصیل کھو کر ایک "تجربہ" ہو کر رہ گئی ہے۔ اُن کی اصلیت تک پہنچنا اور اُن کی بنیاد پر سوانحی نتائج مرتب کرنا' اختلافی مسئلے کا باعث ہوگا۔ اس سے غالب کے خطوں کی خط کی حیثیت سے اہمیت کم نہیں ہوتی۔

(بقیہ سلسلہ صـ ۶۶)

۴۔ ہمزہ یا ے۔ غالب اس بات کے مؤید تھے کہ فارسی مضاف کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو ہمزہ لکھا جائے اور اگر اسکے آخر میں (ے) ہو تو ہمزہ نہ لکھا جائے مثلاً خانۂ خدا، افسانۂ قدیم و اسم ہو کہ (ے) خود ہمزہ کا بدل ہے اس لئے مزید ہمزہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

۵۔ ت یا ط۔ فارسی الاصل الفاظ کو ط کی بجائے ت سے لکھنا درست خیال کرتے تھے مثلاً تفت کی جگہ تفت

۶۔ ہمزہ یا ے۔ ایسے فارسی مضاف اور اردو فعل، جن میں الف کے آخر (ے) ہو ان پر ہمزہ استعمال کرنے کے مخالف تھے مثلاً آسیائے چرخ اور اردو میں آجائے، آئے ہو کی جگہ آجائے، آئے ہو۔ (وا مخ) ہو کہ ان میں (ے) خود ہمزہ کا بدل ہے اس لئے مزید ہمزہ قابل ترک ہے)

افتخار احمد فخر دھولیاوی

غالب کے کلام میں شوخی اور طنز و ظرافت

اردو شاعری میں غالب کی شخصیت اتنی شوخ طرحدار اور تہہ دار کیونکر ہے؟ اسے سمجھنے کیلئے ہمیں غالب کے اس معرکہ کے عہد کو ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ ان عوامل کا پتہ لگانا ہوگا جن کے اثرات نے غالب میں ہر چیز سے دلچسپی لینے اور محفوظ ہونے کی صلاحیت کو مہمیز کیا نطرتاً وہ حیوانِ ظریف واقع ہوئے تھے۔ ان کے مزاج کا خاصہ یہی تھا کہ وہ زبوں حالی پر غلط بات پر انسانی کمزوریوں پر یہاں تک کہ اپنے آپ پر بھی ہنس سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر بات لطیف احساسات کو بیدار کرتی ہے۔ انہیں زندگی عزیز تھی۔ اس سے پیار تھا دلچسپی تھی۔ جس نے انہیں اس کے مختلف پہلوؤں پر مسکرانا سکھا دیا تھا۔ اس میں ان سماجی تہذیبی اور فکری عناصر کو زیادہ دخل ہے جس کی کہ وہ پیداوار تھے۔ مغلوں کی رچی ہوئی تہذیب کی شکست و ریخت اور نئے نظام کے جیتے ہوئے قدم کے نشانات انھوں نے دیکھے تھے اور ان میں وہ خود اعتمادی و پختگی پیدا ہوگئی تھی جو اس انحطاط پذیر معاشرہ نے لوگوں کے اندر پیدا کر دی تھی اور انہیں اپنے قدموں پر کھڑے رہنا سکھا دیا تھا۔ غالب کا تعلق بھی اگرچہ اسی جاگیر دارانہ نظام سے رہا ہے اور انہیں اسی باعث علمی اور تاریخی لحاظ سے اس قدر گہرا ادراک حاصل نہیں تھا کہ وہ واقعات کے دور رس نتائج تک پہنچ سکتے۔ ان کے خطوط میں اس دم توڑنے والے نظام کے جیتے جاگتے مرقعے تو نظر آتے ہیں مگر اس تبدیلی پر کسی برہمی کا احساس نہیں ملتا۔ اگرچہ غالب کے یہ اردو خطوط ان کی زندگی کے آخری عمر کے بیس برس تک کا ہی احاطہ کرتے ہیں محققین کو ابتک ان کے سب سے قدیم اُردو خط کا جو سُراغ ملا ہے وہ ۱۸۴۸ء کا ہے

یوں تو ان کے خطوط میں جو شوخی اور ظرافت ہے مولانا حالیؔ نے "یادگارِ غالب" میں مکمل جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہر پہلو سے بحث کی ہے اور ان لطیفوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کو حیوانِ ظریف" ثابت کرتے ہیں مگر یہاں مرزا کے کلام سے ہمیں غرض ہے۔

ان کی شاعری مختلف موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جن میں ان کے مزاج کی شوخی نے زندگی اور حرارت لائی۔ جدت و رنگینی پیدا کر دی ہے۔ جب کوئی چیز انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہونے لگتی ہے۔

تو اس کی قدر و قیمت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کی شوخی کا یہی سبب بتایا ہے وہ کہتے ہیں[1]۔ "نشاط کا تصور جس کو مغلوں کی تہذیب نے پیدا کیا تھا اس کو باقی رکھنے کا خیال زیادہ شدید ہو گیا تھا اور ہر شخص نشاطِ حیات کی طرف دوڑتا نظر آتا ہے۔ شاعر اس میں پیش پیش ہیں۔ غالب کی شوخی بھی دراصل اسی نشاطیہ ماحول کو وجود میں لانے کا نتیجہ ہے" دوسرا سبب غالب کی خود اپنی افتادِ طبع ہے جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

غالب سے قبل سودا اور انشاء کی شوخ نگاری اور طنز و ظرافت کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ جن کی بنیاد ہی محض شوخی، ہجو اور ظرافت پر ہے۔ غالب کا مزاج ان سب سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شوخی کا ایک رچاؤ سا نظر آتا ہے جو کبھی کبھی ایک تبسم زیرِ لب سے آگے نہیں بڑھتا وہ انشاء کی طرح ہنسوڑ بھی نہیں ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی طنز و ظرافت کے لحاظ سے یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی دور میں شامل نہیں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ "یہ خود ایک دور ایک عہد اور ایک مزاج ہیں اسی طرح جیسے ان سے پہلے سودا اور ان کے بعد اکبر کی حیثیت دیکھ لیں تو اردو طنزیات و مضحکات کا پورا سواد تار تار ہو کر ہمارے پیش نظر ہو جائے گا۔

دراصل غالب کے کلام میں جو شوخی اور رعنائی پائی جاتی ہے اس کی نظیر اردو شاعری میں شاذ ہے۔ ان کے کلام میں شوخیٔ بیان کے امتزاج نے ندرت پیدا کر دی ہے۔ قدرتِ زبان و بیان نے حسنِ تعبیر، جدتِ ادا اور تمثیل سے جو رنگ ابھرتے ہیں شوخی نے ان رنگوں کو اور بھی شوخ بنا دیا ہے جن سے ہر تصویر منہ بولتی نظر آتی ہے اور ایک امتیازی شان پیدا ہو گئی ہے۔

طنز و ظرافت کے وہ پھول کھلائے ہیں کہ ان کی شاعری کا پورا چمن اس مہکار سے عطر بیز ہو گیا ہے۔

غالب کے کلام میں یوں تو عام طور پر شوخی غزل کے جتنے بھی موضوعات ہیں سب پر چھائی ہوئی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ متصوفانہ اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار میں بھی اس کی جلوہ گری ہے۔ جو اس امر کی غماز ہے کہ اس میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کی افتادِ طبع اور پہلودار شخصیت کی ہی اثر آفرینی ہے۔ یہاں تک کہ غزل کے روایتی و فرسودہ موضوعات بھی ان کے طنز کے تیر کا نشانہ بن سکتے ہیں اور اس انداز سے جیسے ان پر وہ برگشتگی کا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ شعر:-

---

[1] نقد احوالِ غالب صفحہ ۳۲

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

یا :— اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ان طنزیہ اشعار میں شوخی کی آمیزش نے لطیف فضا پیدا کر دی ہے جہاں ان کی ظرافت شوخی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے تو وہاں ان کی طنز میں بلا کی نشتریت پیدا ہو جاتی ہے جیسے :—

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آلگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

زاہد تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہارے شرابِ طہور کی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کتنی جنچی تلی رائے دی ہے۔ فرماتے ہیں:—

"اُن کے (غالبؔ کے) ہاں وہی بات جب تک سادہ اور براہِ راست رہتی ہے ہلکے پھلکے مزاج کا نمونہ معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں اس میں معمولی سا غم آیا طنز کا تیکھا پن اور ظرافت کا ستم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کی ظرافت میں جو چیز محض شوخی معلوم ہوتی ہے وہی ان کی طنز میں پہنچ کر نشتر کی طرح چبھتی ہے" مثلاً

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ان کی شوخ نگاری ہی کے سبب ان کی ظرافت بھی سنبھلی ہوئی اور پاکیزہ ہے اور تبسم زیرِ لب سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی چند مثالیں دیکھتے چلئے :—

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

حسن میں حور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں! — بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

یا اس شعر میں دیکھئے شوخی کس انداز کی ہے :—

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

سب تو سب مرزا عارفؔ کے مرثیہ میں بھی وہ ظرافت سے دامن نہ بچا سکے کہتے ہیں :—

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

اردو شاعری میں شوخ نگاری کا ہدف زیادہ تر شیخ و زاہد کو بنایا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں غالب کے ہاں بھی ہیں ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے
کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے وغیرہ

مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاں شوخی زیادہ تر معاملاتِ حسن و عشق کی ترجمانی ہی میں نمایاں طور پر اور بجد و افراط ملتی ہے۔ درجِ ذیل اشعار سے اس کی تصدیق ہو جائیگی سنئے ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

اس قسم کے اور بھی کئی اشعار دورانِ مطالعہ نظر سے گذریں گے۔

محبوب کی ستم پیشگی اور محبت میں مجبوری، ناکامی، معذوری، حرماں نصیبی، نامرادی، گریہ وزاری اور محرومی کے جذبات و احساسات غزل میں مرکزی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور حسرت و یاس کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ مگر ایسے اشعار بھی غالب کے ہاں ان کی فطری شوخ نگاری سے شگفتگی لئے ہوئے ہیں۔ چند اشعار اس قسم کے بھی دیکھتے چلیں ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا وغیرہ

مگر محبت کرنے والے کا غم بھی اس کے باوجود اس شوخی کے نقاب سے جھنکتا نظر آتا ہے مثلاً۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں | شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر | آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا | کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک | ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟"

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں | زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر | ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ رفتار دوست

مرزا کے ہاں رشک کے مضامین میں بھی شوخی کی جھلک ہے ؎

دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا | نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

وہ آکے رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے | ہوئے فدا درو دیوار پر درو دیوار

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف | عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد | مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب | سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اس طرح بت طنّاز کے ناز و انداز و ادا اور جور و جفا کے بیان میں بھی ان سے شوخی نہیں چھوٹی۔

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے | جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا | کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل | نہ کھڑے ہو جئے خوبانِ دل آزار کے پاس

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے | ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا | لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے | یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر باندازِ عتاب | کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

ذیل کے اشعار میں تجاہلِ عارفانہ یا مکرِ شاعرانہ میں شوخی کی معنی خیز جھلک قابلِ غور ہے ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات | سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جاتا

غالب کے کچھ ایسے اشعار جو مبتذل کہلائے جانے کے مستحق ہیں مگر ان میں بھی غالب نے اپنی شوخ نگاری سے شگفتگی پیدا کر دی ہے اور اس طرح سے ابتذال کا پہلو بہت کچھ دب سا گیا ہے ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں　　بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے　　سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی　　گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے
اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں　　شوقِ فضول و ہمتِ مردانہ چاہیے
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ　　جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن
بلا بہ بہانے بوسہ دے کیوں کہے ابھی　　غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں
کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا　　خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

پھر بھی مندرجہ بالا اشعار میں کہیں کہیں متانت و سنجیدگی کی آنکھیں اگر اس نقاب پوش شوخی کے باوجود جھک جانے پہ مجبور ہیں تو اس میں اس دور کی پستی اور میلان عیش پسندی کو دخل ہے جس دور میں غالب نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے۔ سوز جگر کو شغل آتش بازی طفلان سے تشبیہ دیتے ہوئے عشق کے متعلق ایک رباعی میں بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آئے۔ فرماتے ہیں ؎

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال　　ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور سے حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کیلئے گیا ہے کیا کھیل نکال

غزل کی فضا شوخی اور شگفتگی کو کم ہی راس آسکتی ہے مگر غالب نے اپنے آرٹ کے دم سے دل گداختگی، مجبوری، دردمندی، خستگی و دل گرفتگی کے اس لطیف و نازک جسم میں اپنے نفس گرم سے زندگی کی روح پھونکی ہے اور انھوں نے اسے اپنے موقلم سے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے نقوش کے بڑے دیدہ زیب مرقعے تیار کیے ہیں جس میں بڑی رعنائی و رنگینی ہے اور سادگی و پرکاری بھی۔ ان تصویروں کی زندگی سے ہم آہنگی نے غالب کے دیوان کو نگار خانۂ چین بنا دیا ہے۔ مانی و بہزاد کی طرح انھوں نے وہ جادو دانی

نقوش چھوڑے ہیں جن کی جاذبیت و دلآویزی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اسی لئے کبھی انھوں نے کہا تھا ؎

سیکھے ہیں مہ رخوں کیلئے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اتنی سادگی اور معصومیت سے یہ کیونکر کہہ سکتے تھے ؎

آنکھ کی تصویر سر نامہ پہ کھینچی ہے کہ تا　　اس پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرت دیدار ہے

کمال یہ ہے کہ انھیں ایسا کرنے میں بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل کی کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی۔ یہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا نہیں، اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے۔ بلکہ مینائے غزل کی شراب کی اس کی مستی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے کیونکہ یہی شوخی اسے دو آتشہ بنا دیتی ہے"۔

یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ ان کے کلام میں رنگینی رعنائی اور شگفتگی کی گہری چھاپ جو ان کی شوخی اور طنز و ظرافت کی وجہ سے ابھری ہوئی نظر آتی ہے تو وہ ہر چیز کو اسی زاویہ سے دیکھتے تھے اور ان کے سامنے زندگی کے دوسرے پہلو نہیں تھے۔ ایسا نہیں ہے، وہ زندگی کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکے تھے غم و اندوہ کے گلخن میں تپ کر وہ کندن ہو گئے تھے۔ زندگی کے بیشمار نشیب و فراز اور تلخ تجربوں نے انھیں جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا انھیں زندگی کی طلب تھی۔ اگرچہ غم کی گھٹن سے ان کی زندگی ضیق میں رہی مگر وہ مسرت سے بھی آشنا ہوئے اور غم کی آگ میں بھی جلے زندگی کے ہر تلخ و ترش کو برداشت کیا ہر منزل سے گذرے، زندگی کو پرکھا۔ ان تجربات نے ہی ان کی نگاہ میں بلندی پیدا کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ زندگی غم اور خوشی دونوں کا مرقع ہے جیسا کہ انھوں نے کہا تھا ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

عیش و مسرت کی قدر و قیمت غم کے وجود ہی سے ہے اور زندگی کی طلب اسی وقت انسان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے جب وہ غم کی اہمیت کو بھی سمجھے۔ غالبؔ کو زمانے کی گردشوں نے دمونہ زندگی سمجھا دیئے تھے۔ اسی لئے وہ غم کو بھی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ ورنہ اگر ان کے دل میں زندگی کی تڑپ نہ ہوتی اگر وہ غم کی اہمیت کو نہ جانتے ہوتے تو ایسا کہنے پر ہرگز مجبور نہ ہوتے ؎

نغمہ ہائے دل کو بھی اے دل غنیمت جانیو　　بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایکدن

غم زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ضامن ہے۔ زندگی میں دلکشی اسی سے پیدا ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے ہاں زندگی کا ایک فلسفیانہ احساس ملتا ہے۔

غالبؔ کے کلام میں ہر قسم کے جذبات و احساسات کی ترجمانی تو ہے ہی تاہم دوسرے عناصر کے

محمد عبدالقادر احقر عزیزی

غالبؔ بحیثیت محقق لغت

تمہید مرزا نوشہ دبیرالملک، نظام جنگ، نجم الدولہ، اسداللہ خاں متخلص بہ اسدؔ در فارسی و غالبؔ در ریختہ، بحیثیت ایک عظیم شاعر اور نثار ہم لوگوں کے سامنے ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو مرزا کی باطنی خوبیوں سے بھی واقف ہیں اور اس کی واقفیت حاصل کرنی چنداں آسان نہیں۔ مطالعہ اور غواصی کی سخت ضرورت ہے۔ مرزا کی نثر نگاری کا اصل مرقع ان کے خطوط ہیں اور چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے "لطائف غیبی" "تیغ تیز" اور نامۂ غالب بھی ہیں۔

۱۸۵۰ء تک مرزا کی تحریر فارسی میں ہوتی تھی۔ بعد ازاں انھوں نے اردو میں خط و کتابت شروع کی۔ یہ خطوط اپنی مثال آپ ہیں۔ خطوط نگاری میں جو جدت نگاری مرزاؔ نے کی ہے۔ قابل داد ہے۔ ساتھ ساتھ اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ ذیل کا مقالہ ان تمام خصوصیات سے قطع نظر کرتا کے صرف ایک کمال پر درج کیا جاتا ہے۔ یہ موضوع ایسا نہیں کہ خصوصیات خطوط یا طرز تقریظ کو شامل کیا جائے صرف مرزاؔ کا وہ کمال جسے "تحقیق لغوی" کہتے ہیں، زیر بحث ہے۔

غالبؔ ایک محقق مرزا کی تحریریں اس پر شاہد ضرور ہیں لیکن مرزاؔ نے اپنی تحقیق کا اعتراف بھی کیا ہے یا نہیں۔ یہ امر قابل تفحیص ضرور ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرزا نے خود اس کا اعتراف کیا ہے اور چند جگہوں پر اس کا ذکر بھی موجود ہے مثلاً مرزاؔ خود تفتہؔ کو لکھتے ہیں"، ۔

> صاحب دو ۲ باتوں سے مرکب ہے۔ یہ فارسی متعارف، ایک فارسی، ایک عربی، ہر چند اس منطق میں لغات ترکی بھی آجاتے ہیں۔ مگر کمترین عربی کا عالم نہیں۔ مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ پس اتنی بات ضرور ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طالب رہتا ہوں فارسی میں مبدأ فیاض سے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میری ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"
>
> پھر آخر میں لکھتے ہیں: "فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے"۔

تحقیقی پہلو

جہاں تک مرزا کے لفظی یا لغوی تحقیق کا تعلق ہے وہ چند طریقوں پر مشتمل ہے۔ پہلا وہ طریقہ جو مرزا نے کتابوں پر تقریظیں لکھیں۔ جس میں لفظی، معنوی اور تخیلاتی تحقیق شامل ہے۔ دوسری وہ اصلاحیں جو براہ راست خطوط کے ذریعے عمل میں آئیں جس سے لفظی تحقیق ہوتی ہے۔ خطوط پڑھنے سے اس بات کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا کو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ قواعد اور لغت پر کتنا عبور حاصل تھا۔ مرزا نے کسی یونیورسٹی سے ڈگری نہیں لی تھی۔ بلکہ ان کا تجربہ، غور و فکر اور تعمق مطالعہ اس بات پر دال ہے کہ وہ ایک بہت بڑے محقق تھے اور جو تحقیقی اصلاحیں مرزا نے کی ہیں قابل داد ہیں۔

طرز تحقیق

مرزا کا طرز تحقیق بھی نرالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک علامۃ الاجل فاضل الاکمل حلقۂ شاگرداں میں بیٹھا تقریر کر رہا ہے ایسا لگتا ہے ایک ٹیچر کلاس میں طالب علموں کو قواعد کا سبق پڑھا رہا ہے اور وہ ٹیچر ایسا ہے جس کے سامنے الفاظ، معانی، لغت و قواعد کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کبھی کبھی دقت اور باریکیوں پر ٹھیک اسی طرح معترض نظر آتے ہیں جیسے ایک ٹیچر طالب علموں کے سامنے، کبھی خود مرزا مشکل مسائل میں خود ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں اور اعتراضات اور سوالات کے مدلل جواب بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ ٹیچر کا تبحر علمی کچھ اتنا وسیع ہے کہ مثالیں بلا روک ٹوک پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اصلاح اور تحقیق کے درمیان اکتاہٹ کا نام و نشان نہیں، نہ طالب علم گھبراتا ہے نہ استاد جھلاتا ہے۔ ایک طالب علم ہے کہ اُستاد کی باتیں سننے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ کبھی کبھی مخاطب کی کج فہمی اور کور مغزی پر نفریں کے ساتھ ساتھ زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کر جاتے ہیں، مخاطب کے شکوک کا ازالہ بھی فرماتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنی مدلل تحقیق کی صحت پر چیلنج بھی دیتے ہیں۔

طرز تحقیق کا نمونہ

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں ــــ

"پیر شود بیاموز، تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو۔ لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور خیالات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو۔ لیکن کہیں موافق واقع ہوتا ہے کہیں مخالف"

پھر آگے فرماتے ہیں ؎

یک وجب جائے بگوئی تو زخوں پاک نبود
کشتہ بر کشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

یہاں "ہیچ نبود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں۔

پھر صاحب برہان قاطع کا کیا ذکر کرتے ہو وہ ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے۔ زیر زبر پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا۔ لکھتا ہے "یوں آیا ہے" اور "یوں دیکھا ہے" جس لغت کو کاف عربی سے لکھے گا اُسے

کاف فارسی سے بھی لکھے گا۔ جس کو طائے حطّی سے لائے گا۔ اُسے تائے قرشت سے بھی لائے گا۔
فضلائے کلکتہ کے حاشیے دیکھو وہ کیا اس کی تحمیق کرتے ہیں" نبیا' نبرت کے مشتقات سے ہرگز نہیں۔ اور "امامن" امام کے مشتقات میں سے زینہار نہیں' نبی بخش کا مخفف "نبیا" اور امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو امامی اور اگر مونث ہے تو امامن' طغرئی نے ہندی لغت لانے کا التزام کیا ہے ؎

وقت آں آمد کہ مینا ڈاگ ہندی سر کند

اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں۔ مگر کیا کریں گڑگانواں ایک گاؤں کا نام ہے اس کو کیوں کر بدلیں۔ ہاں بہ رائے قرشت لکھیں گے۔ لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا وہ لکھنو بغیر ہائے مخلوط (ھ) کے کہیں گے۔ فی زمانشا چھاپ کو چاپ بولتے ہیں۔ عرفی جھکڑ کو جکر بولتا ہے ؎

آں باد کہ در ہند گر آید جکر آید

رائے ثقیل' ہائے مخلوط' بہ تشدید یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں' صاحب برہان قاطع اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور اہل ہند اس کو مشترک جانتا ہے"۔

آگے فرماتے ہیں:—

ایک تو یہ کہ ارغنون کو بہ غین مضموم میں نے سہو سے لکھا ہے۔ در اصل ارغنون بغین مفتوح اور مخفف اس کا ارغن اور مبدل منہ ارگن ہے" دوسرے یہ کہ موسوی خاں نے "ایرائے" کو "ایرا" لکھا تو اس کی صحت میں کوئی تامل نہیں رہا۔ یکشنبہ ۱۳ مئی ۱۸۶۶ء

طریقہ تحقیق مرزا کی تحقیق کا طریقہ یا تحقیق میں جو رعایتیں ملحوظ رکھتے ہیں۔ قابل داد ہیں اور قابل فخر بھی ہیں۔ مرزا جب کسی لغت کی تحقیق کرتے ہیں تو اس لفظ کے مادّے سے بحث کرتے ہیں' پھر مشتقات سے اس طرح لغت کا ہر پہلو اجاگر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح افعال کی تحقیق میں مادّہ تفصیل اور تعریف کے ذریعے لفظوں کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں تاکہ موجودہ لفظ کسی بھی شکل سے مشابہ یا متوازن ہو جائے۔ اسما' اور دیگر حروف مفرد و مرکب کو تو قواعد کی تمام میزان پر تولتے ہیں اس کے بعد فصاحت اور بلاغت کی ترازو پر' ایسی صورت میں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لفظ ذرا بھی بے وزن اور کھردرا نہیں رہتا۔ اگر کبھی یہ عیب باقی رہ گیا تو اُسے نکال دیتے ہیں' کسی لفظ کا اصل منبع' سنگم یا دہانے کا پتہ چلنے کے بعد ہی اس کی تحقیق ہو سکتی ہے ورنہ وہیں منقطع ہو جائیگی۔ تحقیق میں مرزا حرکات و سکنات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ رسم الخط اور املا کی غلطیوں پر بھی کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور غضب تو یہ ہے کہ نقطہ تک کی تحقیق غور سے کرتے ہیں' لفظ چاہے جس زبان کا ہو تحقیق کرتے ہیں۔ اگر سلف کے عمل کئی طرح کے ہوتے ہیں تو

اختیار دیتے ہیں جیسے میر مہدی مجروح کے خط میں مذکر و مونث کی تحقیق موجود ہے۔

ایک خوبی جو مرزاؔ کی تحقیق میں سب سے زیادہ نمایاں اور قابل داد ہے وہ یہ ہے کہ ایک لفظ کی تحقیق کے ساتھ اس سے مربوط تمام مترادفات، ہم صوت، ہم شکل، نیز ہم معنیٰ الفاظ کی بھی تحقیق کر جاتے ہیں، جس سے ہر قسم کے شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ تحقیق میں تمام عیوب جو مانع فصاحت و بلاغت، صنائع و بدائع ہیں نکال دیتے ہیں۔ لہٰذا اسی رعایت سے اکثر جگہ مرزاؔ اسی طرح لکھتے ہیں لفظ "فصیح و صحیح" "لفظ اصح و افصح" "جملہ اصح و افصح و ابلغ ہے" وغیرہ۔

صفتِ تحقیق

مرزاؔ کی تحقیق جملہ کمالات سے مالا مال ہے۔ ہر چند مرزاؔ نے تحقیق میں بھی مقفّیٰ اور مسجّع عبارت سے کام لیا ہے جو عام فہم نظر نہیں آتا۔ اس کی خاص وجہ مرزاؔ کی مجبوری اور تقاضائے وقت ہے، دوسرے مرزاؔ "قل و دل" کے قائل ہیں اور اس کے عامل بھی ہیں۔ اگر اس صفت کو نہ اپناتے تو خط، خط نہ رہتا بلکہ ایک دفتر معانی ہو جاتا۔ کم لفظوں میں مطالب کی ادائیگی ممکن نہ ہوتی۔ پھر خطوط کے بارے میں جو خیال مرزاؔ کا ہے وہ ثابت نہیں رہتا۔ لہٰذا اس صفت کو اپنانا ضروری تھا، ورنہ خطوط کی خوبیاں، طرز اور جدت بھی ختم ہو جاتی۔ مرزاؔ نے اس صفت کو برقرار رکھ کر ایک حسن اور پیدا کر لیا اور وہ یہ ہے کہ دوران تقریر یا تحریر دور از کار بحثیں داخل نہ ہو سکیں، اور نثر اور خطوط بدنامی سے بچ گئے۔ مرزاؔ کا اسلوب بیان ہی قابل فخر ہے جو عام محققین سے ممتاز کرتا ہے جس سے قدرے سختی تو ضرور آ گئی لیکن صفت کہیں بڑھ گئی۔ اگر اب بھی سمجھ میں نہ آئے تو ظرف محقق کا قصور ہے، بحر علم کا نہیں۔

فنی تحقیق کا عنصر

مرزاؔ کی تحریر میں فنی تحقیق کا عنصر کثرت سے پایا جاتا ہے، بظاہر فن اور لغت دو چیزیں ہیں لیکن بباطن دونوں میں جسم و جان کا تعلق ہے۔ لغت کا بہترین استعمال فن کہلاتا ہے چاہے وہ استعمال نظم میں ہو یا نثر میں، خط میں ہو یا تقریظ میں۔ بہرحال بات ایک سی ہے۔ مرزاؔ فن میں کمال رکھتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قواعد و ضوابط از بر ہیں۔ مرزاؔ تفتہؔ کو لکھتے ہیں "حضرت اس غزل میں پروانہ، پیمانہ، بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے۔ اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ، مستانہ، مردانہ، ترکانہ، دلیرانہ، شکرانہ سب ناجائز و نامستحسن، صنعت ایطا بھی قبیح، مجھے بہت تعجب ہے انہی قافیوں میں ایطا کا حال لکھ چکا ہوں۔ پھر تم نے غزل مبنی انہی قوافی پر رکھی، کاشانہ، شانہ، افسانہ، جانانہ اور فرزانہ یہ قافیے کیوں ترک کر دئے۔ یاد رہے، ساری غزل میں مردانہ، مستانہ یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے۔ دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہو گئی۔" ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں، کیا استادانہ رنگ نمایاں ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی موجود ہے۔

لفظی تحقیق کا عنصر

مرزاؔ کی تمام تر تحریریں جو تحقیق پر مبنی ہیں، اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مرزاؔ کی تحقیق چاہے

نفی ہو، لفظی ہو یا معنوی، تحقیق لغوی کا درجہ ضرور رکھتی ہیں اور یہ سب کے سب لغت کے اجزا، میں سے ہیں۔ کس بے باکی سے تحقیق اور تصحیح کرتے ہیں اور غلط کاروں پر طعن و تشنیع کی بوچھار کرتے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"زماں لفظ عربی از منہ جمع دونوں طرح فارسی میں مستعمل ہیں، زمانی، یک زماں، ہر زماں، زماں زماں، دراں زماں، دراں زماں، سب صحیح اور سب فصیح، جو اس کو غلط کہے وہ گدھا۔ بلکہ اہل فارس نے موج اور موجہ یہاں بھی (ہے) بڑھا کر زمانہ استعمال کیا ہے۔ یک زمان کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا سعدی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت، سنو! میرے ہموطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دیکر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا کہ وہ گھا گھس عبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل، صوتکدہ، شفقکدہ، اور نشترکدہ اور ہمہ عالم وہمہ جا کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ایسا ہی ہوں جو یک زماں کو غلط کہونگا، فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔"

چہار شنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۳ء

معنوی تحقیق کا عنصر مرزا تحقیق کے معاملے میں بہت سخت ہیں اور یہی سخت گیری عمدہ محقق کی پہچان ہے۔ ایک نقطہ کے ہیر پھیر سے معنی میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ خدا، جُدا ہوتا ہے مرزا تحریر میں لفظ، املا، اور معنوی حرکات و سکنات پر بھی کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ کلام کے معنی کا انحصار حرکات و سکنات پر مبنی ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"بھائی ایمیا اور ہیمیا خرافات ہے اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو، افلاطون اور بوعلی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے، کیمیا اور سیمیا دو علم شریف میں ہیں، جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ کیمیا اور جو اسماء سے تعلق رکھے وہ سیمیا ہے

جان غم سیمیا نخورد ہے دل سوئے کیمیا نیاورد دم

شعر بامعنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے وہ حق ہے کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے زماں و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا۔ ہزار جگہ میں زماں و زمانہ کو نظم و نثر میں دیکھا ہوگا۔ وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا۔ سمجھو پہلا مصرعہ لغو، دوسرے میں نبرد کا فاعل معدوم، حلقہ "زا" کی "زے" پہ نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ حلقہ را درست نہ حلقہ زا درست، مگر یہ فارسی بے دلانہ ہے خیر رہنے دو، مصرعہ

گردش چرخ استخواں سائید

اس سے بہتر ہے کہ ؎
"سودہ شد استخواں ز گردشِ چرخ"

لغوی تحقیق کا عنصر

گرچہ مذکورہ بالا تمام عناصر لغوی ہی ہیں۔ لیکن ظاہری اختلاف کی بنا پر الگ الگ ذکر کرنا ضروری ہوا۔ لہٰذا چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے لغوی تحقیق کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"ذرّاعہ کو یہ نہیں کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدد ہے۔ شعرا اسکو مخفف بھی باندھتے ہیں سعدی کے مصرعے سے اتنا تو مقصود حاصل ہوا کہ دراعہ بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے کہ جادّہ اور ذرّاعہ دونوں عربی لغت ہیں اور وہ دال کی تشدید اور یہ را کی تشدید سے مگر خیر جادہ اور دراعہ بھی لکھتے ہیں یہ نہ کہو کہ دراعہ ہرگز نہیں، یہ کہو کہ دراعہ بے تشدید بھی جائز ہے۔"

دوسرا نمونہ

تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"برگ دنیا نسا ز دنیش بود" یہ کوئی لغت نہیں ایک لفظ نہیں جو کسی لغت میں نکل آئے۔ نہ یہ طرز تحریر ہی کسی کو یاد ہے کہ اس کی نظیر کہاں موجود ہے۔ اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں، دو جوتیاں آپ لگا دیں، ایک جوتی تم سے لگوا دی، اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ" میں برہان" کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ "چار شربت" اور غیاث اللغات کو حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔"

تیسرا نمونہ

"صاحب' سداب کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے یہاں بھی ہے تمہارے یہاں اچھا نہیں بندھا تھا۔ اس واسطے کاٹ دیا۔ قراب کون سا غریب لفظ ہے۔ جس کو اس طرح پوچھتے ہو۔ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے،" "قراب اور سداب" دونوں لغت عربی الاصل ہیں۔

عربی فارسی لغوی تحقیق

مرزا نے جیسا ذکر کیا ہے کہ میں عربی زبان اور لغت کا محقق نہیں۔ لیکن یہ انکی انکساری ہے۔ وہ اس زبان میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ہندی نژاد' فارسی اور عربی زبان کا ماہر ہونے کے علاوہ ایک زبردست محقق بھی ہے، کتنی صفائی بے باکی اور روانی کے ساتھ تحقیق پیش کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمام نشیب و فراز نظر کے سامنے ہے اور جیسے چاہتا ہے لکھے چلا جاتا ہے۔ الفاظ کی تحقیق میں مترادفات وغیرہ کا ایک بادل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی سطح نے موتی سطح آب پر بکھیر دیے ہیں اور غواص لغت چن رہا ہے نہ غوطہ کی ضرورت، نہ وسائل کی حاجت، ذیل میں ایک خط جو میاں داد خاں سیف الحق، سیاح کو لکھا ہے، تحقیق کا بے مثال نمونہ ہے، درج کیا جاتا ہے :-

"ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے کہ عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا جس لغت میں (ع) ہو اس کو سمجھنا کہ عربی ہے۔ بعد معلوم ہونے اس قاعدے کے کہ غربال عین نقطہ دار کسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور لام یہ لغت فارسی ہے۔ ہندی اس کی چھلنی اور مرادف اس کی پرویزن یعنی فارسی میں چھلنی کو غربال اور پرویزن کہتے ہیں اور چھلنی ایسی چیز نہیں جسے کوئی نہ جانے، رہا عربال اور عریال، عین سعفص اور یائے تحتانی سے فصیح اور غیر فصیح کیا بلکہ غلط محض اور محض غلط ہے۔ ہاں اگر عربی میں چھلنی کو عریال کہتے ہوں تو فارسی غربال اور عربی عریال، مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ عربال کا عربی میں کچھ اور اسم ہوگا، غربال نہ کہتے ہونگے اب تم سنو! فن لغت میں ایک امر ہے کہ اس کو تصحیف کہتے ہیں، یعنی لفظ کی صورت ایک ہو اور لفظوں میں فرق جیسا سعدیؔ بوستاں میں کہتا ہے ؎

مرا بوسہ گفتا کہ تصحیف دہ کہ درویش را توشہ از بوسہ دہ

توشہ، بوسہ، نوشہ، یہ تین لفظ مصحف ہمدگر ہیں، حالانکہ معانی میں وہ فرق کہ جیسا زمین اور آسمان، توشہ ترجمہ زاد کا بوسہ ترجمہ قُبلہ کا اور نوشہ اسم دولہا کا، صاحبانِ فرہنگ میں برہان قاطع والا بھی تصحیف میں مبتلا ہے گزرا اور گذر، خرپزہ اور خربزہ۔ کہتا ہے کہ "سدا" بہ سین سعفص لفظ فارسی ہے۔ بمعنی آواز اور "صدا" یہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات تے میں لکھتے ہیں انہی لغات کو طوے میں لکھتا ہے حالانکہ جس طرح عین فارسی میں نہیں اسی طرح طوے بھی نہیں مثلاً تشت لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوے سے غلط ہے۔ برھان قاطع والا اس کو طوے سے بھی لایا ہے اور تے سے بھی۔ محققین جانتے ہیں کہ صدا بمعنی آواز لغت عربی الاصل ہے نہ معرب اور سدا بہ سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے، ہاں اردو کے محاورے میں ہمیشہ کے معنی میں مستعمل ہے، قصہ کوتاہ، غربال بمعنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل صحیح اور فصیح ہے اور عریال کبھی اور فرہنگ عربی میں مثل "قاموس" اور "صراح" وغیرہ کے بمعنی چھلنی نکلے تو اس کو مانو، ورنہ یہ برہان قاطع والے کے خرافات میں سے ہے ۱۲ غالب ۲۰؍ فروری۔

غالب کی لغت

غالب کے لغوی تحقیق کا بے مثال نمونہ "قاطع برھان" ہے جو "برھان قاطع" کا جواب ہے مرزا نے کس طرح برہان قاطع کی غلطیوں کا پھریرا اڑایا ہے دیکھنے کے لائق ہے اور یہی مرزا غالب کی اپنی خاص لغت کہی جاتی ہے۔

مضمون کافی طویل ہوچکا ہے لیکن ہنوز تشنگی باقی ہے' چلتے چلاتے چند الفاظ غالب پر لگائے گئے الزامات کے سلسلے میں کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں چونکہ ؏ مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات'

"علی گڈھ میگزین" غالب نمبر" جلد ۲۴' نمبر ۲ بابت ۱۹۴۸-۴۹ء صفحہ ۱۲۱ تا ۲۱۲

جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا پٹنہ کا طول طویل مضمون موجود ہے جس کا موضوع بھی یہی ہے۔ مضمون میں صفحہ ۱۷۲ پر غالب پر جہالت کا الزام موجود ہے اور بزم محققین میں غالب کی جگہ "صف نعال" میں بھی نہیں رکھی ہے۔ علاوہ ازیں صفحہ ۱۷۳ اور ۱۷۷ پر بھی موجود ہے۔ بیرسٹر صاحب کی خفگی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی' الانسان مرکب من الخطاء والنسیان کے مصداق مرزا غالب سے بھی غلطی کا امکان ہے اور ہوئی بھی۔ لیکن یہ غلطیاں "برہان قاطع" کے تعصب میں ہوئیں اور ایک غلطی کو چھپانے کیلئے مرزا کئی غلطیاں کر بیٹھے اس سے انکار نہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بیرسٹر صاحب ماشاءاللہ وکالت پیشہ تھے اور پیشہ کی رعایت خوب خوب ملحوظ رکھی ہے۔ مقدمہ کے سلسلے میں صاحب برہان قاطع اور مرزا ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے تھے لہٰذا ہر آدمی اپنے دعوے' اور دلائل پر گرچہ غلط ہی کیوں نہو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی SUPPORT میں بھاری بھاری ثبوت بہم پہونچاتا ہے اور اس پر اٹل رہتا ہے۔ یہی حال مرزا کا بھی ہوا ہے جو غلطی ہوئی اس کو صحیح ثابت کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انہیں فرضی استاد تک قائم کرنا پڑا۔ لیکن قاضی صاحب نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اور عدالتی مقدموں کی طرح اپنے موکل کو جتانے اور مرزا کو ہرانے کیلئے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ثبوت میں "ماھوچی چشمہ خضر" کی تحقیق بھی پیش کردی اور اسی صفحہ میں "آب دہ دست" کی تحقیق نہیں پیش کرسکے۔ جناب قاضی صاحب کو بیرسٹر کا رول ادا نہ کرکے قاضی کا رول ادا کرنا چاہیے تھا۔ ادب و ثقافت کی عدالت میں ایسا فیصلہ نہیں ہوا کرتا ہے اور نہ ایسی وکالت کی جاسکتی ہے

المختصر:۔ قاضی صاحب کا یہ قول کہ وہ علم تحقیق سے نابلد تھے اور محققین کی صف نعال میں جگہ نکالنی مشکل ہے' صحیح نہیں ہے۔ مرزا ایک مسلم الثبوت محقق ہیں جس کے لئے دلائل اور ثبوت کی ضرورت نہیں کتابیں دنیا کے سامنے ہیں۔ یقیناً غالب' ایک شاعر' ایک نثار اور ایک محقق کی حیثیت سے اسم بامسمی ہیں اور ہر حیثیت سے میدان ادب میں غالب نظر آتے ہیں ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے   سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

۱؎ تفصیل علی گڈھ میگزین غالب نمبر' نگار غالب نمبر۔

تاج پیامی

غالب - ایک عظیم شاعر

ایک شاعر عوام سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی کسی واقعہ کا مشاہدہ تو کرتا ہے لیکن اس سے متاثر ہوئے بغیر بیگانہ وار گذر جاتا ہے۔ اگر متاثر ہوتا بھی ہے تو اسے اپنے جذبات کے اظہار پر قدرت نہیں ہوتی لیکن ایک شاعر جو درد مند اور حساس دل لے کر پیدا ہوتا ہے، وہ زندگی یا کائنات میں ہونے والے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کے پردے پر ہر واقعہ اپنا عکس چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی دور رس نگاہ اس واقعہ کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے اور وہ اس سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے' اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کسی شئے سے تو آگاہی اس کے جذبات کو ابھارتی ہے اور جب وہ اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کیلئے الفاظ ڈھونڈنے لگتا ہے تو ماضی میں اس نے جو کچھ دیکھا' سنا اور محسوس کیا وہ ساری چیزیں اس سلسلے میں اس کی مدد کرتی ہیں اور آخر کار وہ انہیں اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ ان کی قدر و قیمت دائمی ہو جاتی ہے' ان میں ابدیت اور ہمیشگی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر دنیا کا ہر شخص خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو ان میں اپنے دل کی دھڑکنیں سن سکتا ہے۔

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یہ شعر غالب کے داخلی اور خارجی تجربات کے امتزاج کا بہترین ثبوت ہے وہ اپنے غمناک جذبات کی مثال قبل از وقت بجھی ہوئی شمع سے دیتا ہے۔ شبِ تاریک میں غم کا جوش اور زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک عظیم شاعر اپنے اندازِ بیان سے کسی واقعہ کو ایسی توانائی اور تازگی بخشتا ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اگر اس شعر میں ہمیشہ قائم رہنے والی خوبی نہ ہوتی تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو ایک مشہور فلمی گانے ۔۔ "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" کا ہوا۔

واقعی ایک عظیم شاعر کی خوبی "باندازۂ تقریر نہیں"۔ اس کی شخصیت دوسرے شعراء کے درمیان بھی ممتاز نظر آتی ہے۔ شکسپیر اور غالب جس زمانے میں پیدا ہوئے اس وقت شعراء کی تعداد خاصی تھی مگر ان دو عظیم شاعروں کی نکتہ رس نگاہ زندگی کے اہم ترین پہلوؤں تک پہنچی اور پھر انھوں نے جس انداز سے اپنے مشاہدات' خیالات اور جذبات کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ان کی اہمیت اور قدر آج بھی وہی ہے

بلکہ فی زمننا اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کیونکہ جیسے جیسے علم کی ترویج و ترقی ہو رہی ہے ان شعراء کے جوہر کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ غالب اپنی شاعری کی ناقدری کے باوجود اس کی عظمت سے آگاہ تھا۔ آج اسی کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس نے تقریباً ایک سو سال پہلے کہا تھا ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب کے چند اشعار سنئے اور داد دیجئے کہ وہ انسانی فطرت سے کس قدر واقف تھا۔ اس کے بعض شعروں میں ایسے نفسیاتی نکتے ہیں کہ آج کل کے ماہر نفسیات بھی سن کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

افلاطون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب جمہوریہ میں شاعروں کو کوئی مقام نہیں عطا کیا۔ اس نے ایک نظریہ قائم کیا جسے نظریۂ تصور (Theory of Idea) کہتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ دنیا عالم مثال کی ایک نقل ہے۔ اس دنیا کی کوئی شے ہو اس کی اصلیت اس کے تصور میں ہے اور وہ شے اصل کی نقل ہے۔ ایک شاعر اسی نقل کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعہ کرتا ہے یعنی اس کی شاعری نقل کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاعری حقیقت سے دوچند دور ہو جاتی ہے۔

ارسطو افلاطون کا شاگرد رشید تھا اس نے کہا شاعری نقل کی نقل نہیں یہ زندگی کی نقل ہے۔ ایک شاعر زندگی سے مواد حاصل کرتا ہے اور تخیل کی مدد سے فطرت کی امکانی صورت گری کرتا ہے۔ شاعر کائنات اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ہو بہو نہیں پیش کرتا بلکہ جیسا ہونا چاہیئے اس طرح پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے تخیلات، جذبات اور انداز بیان کی مدد سے ایک ایسی شاعری کو جنم دیتا ہے جو ہر شخص، ہر مقام اور ہر زمانہ کیلئے اہم اور حقیقی ہو۔ غالب نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی زندگی اور کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کے انہیں پہلوؤں کو پیش کیا جو ہر شخص ہر مقام اور ہر زمانہ کیلئے اہم اور حقیقی ثابت ہوئے۔

غالب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے ذوق جستجو کی تسکین کسی طرح نہیں ہو پاتی۔ اس کی تمنا کا قدم ایک جگہ نہیں رکتا۔ اس کا کہنا ہے ؎ وداع و وصل جدا گانہ لذتے دارد

غالب کے دماغ میں انسانی زندگی کے متعلق جو بھی اہم خیال آیا اس کی تخیل نے اس سے ایک حسین پیکر تراش لیا اور اس کے جذبے نے اس میں دلفریب رنگ بھر دیا۔ اس کے اشعار پڑھئے پھر دیکھئے کیسی حسین حسین صورتیں نظر کے سامنے آنے لگتی ہیں۔ غالب کے اشعار اس عظیم مصور کی یاد دلاتے ہیں جو اپنی تصویروں میں رنگ کی بجائے خون دل استعمال کرتا تھا۔ غالب خود کہتا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

غالبؔ کی شاعری کیا ہے؟ غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

یہ شعر ایک طرف غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسری طرف منفرد حیثیت سے جو حسنِ صورت پیش کرتا ہے اس کی مثال دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم ملتی ہے۔ اس شعر میں کئی صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ موجۂ گل، چراغاں، گذرگاہِ خیال، جلوہ نما اور موجِ شراب، یہ سب صورتیں بظاہر الگ الگ ہیں پھر بھی الگ نہیں کیونکہ ان کے امتزاج سے جو رنگ ابھرتا ہے وہ ایک ہی کیفیت کو پیدا کرتا ہے جو نشاط انگیز ہے۔ پھول ہو یا معشوق کے تصور کی فسوں کاری۔ یہ ساری چیزیں ایک ساتھ مل کر ایسا حسین "پیکرِ تصویر" پیش کرتی ہیں کہ ہر شخص غالبؔ کی فنکارانہ اور شاعرانہ عظمت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے متعلق ایک شعر اور سنئے ؎

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

غالبؔ کی شاعری ایک ایسا جلوہ ہے جسے دیکھنے کے لیے شعور کے شش پہلی آئینہ کی ضرورت پڑتی ہے اور سمجھنے کیلئے انسانی ذہن کو مختلف گذرگاہِ خیال سے گذرنا پڑتا ہے اور جب اس کی شاعری کا جلوہ آشکار ہو جاتا ہے اور اس کا معنی سمجھ میں آجاتا ہے تو انسان کہہ اٹھتا ہے۔ اس میں تو میری ہی شکل نظر آرہی ہے اس میں تو میرے ہی دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے اور یہ محض اس لئے ہے کہ اس کی شاعری زماں اور مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ اس میں ایسی تازگی، توانائی اور زندگی ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی۔

کیٹس نے شکسپیر کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"IT STRUCK ME WHAT QUALITY WENT TO FORM A MAN OF ACHIEVEMENT ESPECIALLY IN LITERATURE - I MEAN NEGATIVE CAPABILITY, THAT IS, WHEN A MAN IS CAPABLE OF BEARING UNCERTAINTIES, MYSTERIES, DOUBTS, WITHOUT ANY IRRITABLE REACHING AFTER FACT AND REASON"

اور یہی بات غالبؔ پر بھی صادق آتی ہے۔ اسے اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار پر بے مثال قدرت حاصل ہے۔ وہ دقیق سے دقیق فلسفیانہ خیالات اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائلِ تصوف کو محض دو مصرعوں میں بیان کر دیتا ہے۔ معنی کے سمندر کو چند الفاظ کے کوزے میں بند کرنا کوئی غالبؔ سے سیکھے ؎

(۱) دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مگر ستم ظریفی تو دیکھیے غالبؔ کی اسی خوبی کو دقت پسندی کا نام دیا گیا اور اس کے ہم عصر شعراء نے اس کی شاعری کو یہ کہہ کر سمجھنے سے انکار کر دیا ؂

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے "
(حکیم آغا جان عیشؔ)

آج وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے غالبؔ کی شاعری جسے وہ بُرا کہہ رہے تھے جزوِ پیغمبری ثابت ہوئی۔ حالیؔ نے غالبؔ کے ہم عصر شعراء کے کلام کو مدِ نظر رکھکر اس کے حسنِ کلام کی تعریف یوں کی ہے ۔۔

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اقبالؔ نے بھی غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے ۔

"فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا"

عبدالرحمٰن بجنوری نے تو یہاں تک کہہ دیا "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس ویدؔ اور دیوانِ غالبؔ"۔ انھوں نے شاید اس لئے ایسا کہا تھا کہ غالبؔ کے دیوان کی خصوصیت بھی کچھ الہامی کتاب کی سی ہے۔ اوّل یہ کہ کیا ہے جو غالبؔ کے دیوان میں نہیں ہے ع "سو جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے"۔ دوم، غالبؔ کے دیوان کی شرح بھی ایک الہامی صحیفے کی تفسیر کی طرح مختلف لوگ مختلف زمانہ میں مختلف انداز سے کرتے آئے مندرجہ ذیل اشعار پڑھیئے اور غالبؔ کے عرفان و وجدان اور فکر و نظر کی داد دیجئے ۔

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالبؔ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اس کے اشعار الہامی ہیں ؂

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کی شاعری الہامی کم اور تجرباتی زیادہ ہے۔ وہ زندگی کے جن مراحل سے گذرا جو تجربات اس نے حاصل کئے اور جن واقعات و حادثات سے وہ دوچار ہوا ان کا اظہار اپنی شاعری میں اس نے بڑے پُر خلوص انداز میں کیا ہے وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوا (۱۷۹۷-۱۸۶۹) جب مغلیہ دورِ حکومت ختم ہو رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی تواریخ (مہر نیم روز) لکھنے کے سلسلے میں اس کی رسائی مغلیہ دربار میں بھی ہوئی۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد وہ ظفرؔ شاہ کا اُستاد بھی ہوا وہ ایک طرف مغلیہ سلطنت کی عظمت سے واقف تھا تو دوسری طرف

اس سلطنت کی بربادی بھی دیکھ رہا تھا اس کی نگاہ اپنی زبوں حالی پر بھی تھی آئیے ایک عظیم سلطنت اور ایک عظیم شخصیت کا سامانِ ماتم دیکھئے :-

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۔۔۔ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

دو شعر اور سنئے :-

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی ۔۔۔ سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔۔۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

۱۸۵۷ء کا غدر اس کے سامنے ہوا اور اس کے بعد جو انقلاب عظیم آیا اس نے زندگی کی قدروں کو یکسر بدل ڈالا ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب ۔۔۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے اس عظیم واقعہ کو جواں مردی سے برداشت کیا۔ اس نے فرنگیوں کے خلاف تلوار تو نہیں قلم ضرور اٹھایا ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں

وہ بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح واقف رہا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ آئینِ اکبری کا دور ختم ہوگیا اب دخانی جہاز کا زمانہ ہے ؎ "بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم"۔

اس نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے دور کی صرف ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ ایک مصلح قوم کا بھی کام سرانجام دیا۔ ایک عظیم شاعر مصلح قوم بھی ہوتا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ حیوانیت اور بہیمیت ہر طرف رقص کر رہی ہیں ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔۔۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس لئے اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی ! ۔۔۔ نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی ۔۔۔ بخش دو گر خطا کرے کوئی

اور پھر اپنے زمانے کے انتشار کو یہ کہکر دور کرنے کی کوشش کی ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ۔۔۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

غالب کی شاعری میں بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک ایک عظیم سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ میتھو آرنلڈ کی زبان میں اُسے HIGH SERIOUSNESS کہتے ہیں۔ عظیم شاعری کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ سنجیدہ ہو۔ غالب کے نزدیک اس کی وجہ شاید وہی ہو جو اس نے بیان کی ہے ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل   اِنسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے   غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

"غمِ روزگار" کا لفظ سب سے پہلے غالب نے استعمال کیا۔ اُس کو اس کا تجربہ بھی تھا۔ اپنے آبا و اجداد کی سو پشت کی سپہ گری پر ناز کرنے والا جاگیر دار کا فرزند مغلیہ سلطنت کی بربادی کے ساتھ اپنی تباہی بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کہا تھا "رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن" اس کی عظیم شاعری کی ناقدری اسکے مُنہ پہ کی جا رہی تھی۔ اس کی اولاد اس کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ اس کا بھانجہ عارف جواں سال مرگیا۔ اوروں کی پہ تو بلائیں اشعار کی شکل میں نازل ہوئیں لیکن غالب پر بلائیں مصیبت بن کر آئیں کئی بار وہ خانماں برباد ہوا۔ عین عالم جوانی میں اس کا چہیتا بھائی یوسف پاگل ہوگیا۔ ستم بالائے ستم ایک عزت تھی وہ بھی جیل خانہ کی نذر ہوگئی ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

لیکن غالب۔ ایک عظیم شاعر محض مرگِ ناگہانی کا منتظر نہ رہا بلکہ اُس نے اپنی چشم کو ہر رنگ میں وا رہنے کی تعلیم دی اور اپنے دل کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا۔ ع "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک"

لیکن حالیؔ نے غالب کو حیوانِ ظریف کہا ہے۔ غالب نے ظرافت کا رنگ اپنے چند اشعار میں محض الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت کے ذریعہ پیدا کیا مگر مقصد ہمیشہ سنجیدہ رہا اور یہ کام ایک عظیم فن کار ہی کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پہ نہیں ہوں میں   خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے   کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

حالیؔ نے غالب کے خطوط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو حیوانِ ظریف کہا ہے۔ اس کا ظریفانہ رنگ اس کے خطوط میں بے حد نمایاں ہے۔

غالب کے چند اشعار پڑھئے تو شبہ ہوتا ہے کہ اس نے گوتم بدھ کی طرح دنیا کو رنج و الم سے بھری دیکھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہاں اس نے مصائب و محرومیٔ غم و آلام کا اظہار اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ اگر وہ قنوطی ہوتا تو انسانی عظمت کا یہ ترانہ کیوں سُناتا ؎

ز ما گرم ست ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را   قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

محمد ایوب واقف

غالب میری نظر میں

جب میں کہوں کہ غالب کی شاعری انسانی فطرت کی مرقع نگاری، انسانی جذبات کی آئینہ داری حسنِ بیان کی طرفگی اور اخلاقی، صوفیانہ و فلسفیانہ خیالات کی ادائیگی سے اتنی پہلو دار ہو گئی ہے کہ اس کی اہمیت وافادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تو قارئین میرے اس قول کی فرسودگی پر نہ جائیں اور نہ ہی یہ سوچیں کہ میں رسمًا یا تقلیدًا ایسا کہہ رہا ہوں اردو زبان و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنی بساط کے مطابق میں نے غالب کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، غالب کی شخصیت اور فن سے متعلق ہند و پاک کے بیشتر ادیبوں اور نقادوں کی رشحاتِ قلم سے بھی استفادہ کیا ہے۔ غالب کے جن اشعار کو میں خود سمجھنے سے قاصر رہا ہوں اپنے باذوق دوستوں اور بزرگوں سے ان اشعار کے معنی و مفاہیم جاننے کی جد و جہد کی ہے غالب کے مستند شارحین کی شرحیں بھی پڑھی ہیں پھر اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ غالب واقعتاً بڑا ہی باکمال اور پرگو شاعر تھا اس کے جدت طراز ذہن نے فکر و معنی کے نئے نئے دروازے کھولے، فن شعر کی ایک منفرد طرز ایجاد کی، فلسفہ و حکمت کی بڑی بڑی گتھیاں سلجھائیں، علم و عرفاں کی وہ قندیل روشن کی جس کو کبھی مدھم نہیں ہو سکتی۔ اس کا ہر شعر ایک کوزہ ہے جس میں دریا کی وسعت ہے ۱۱ سال کی عمر میں اس نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا اور ۲۶ سال کی عمر میں اس سے قطع تعلق کر لیا لیکن اس قلیل عرصے میں غالب نے اردو ادب کو جو کچھ دیا وہ ایک گراں قدر سرمایہ ہے جس کی اہمیت خود غالب کے عہد میں بھی تھی آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہیگی یہ ایک امر مسلمہ ہے اور میں اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ لیکن جب مجھے کوئی یہ کہے کہ غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے اور پھر وہ اس بات پر بضد ہو کہ میں اس کی رائے کو بسر و چشم تسلیم کر لوں تو میرے لئے یہ ایک انتہائی مشکل چیز بن جاتی ہے۔ میں ذاتی طور پر اپنے ان احباب و بزرگان کا ہمنوا ہرگز نہیں ہو سکتا جو غالب کو سب سے بڑا شاعر کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے غالب فارسی کا سب سے اعلیٰ و ارفع شاعر ہو اس لئے کہ اس کا فارسی کلام اس کے سن و شعور کی پختگی کے دور کی تخلیق ہے اس کی فارسی دانی اور فارسی لب و لہجہ بھی قابل رشک ہے اس کے فارسی قصائد، فارسی غزلیں اور فارسی رباعیاں اس زبان کے عظیم المرتبت شعراء انوری و خاقانی، عرفی و سعدی اور عمر خیام جو قصیدہ گوئی، غزل گوئی، اور رباعی کیلئے مشہور ہیں حسن و خوبی میں برتر ہیں، لیکن جہاں تک اردو شعر و شاعری کا تعلق ہے غالب بعض معاملوں میں اردو کے دیگر شعراء کے مقابلے میں کمتر نظر آتا ہے، غالب کی شاعری میں محض محاسن تلاش کرنے والے اور اس کے کلام کو شخصی پرست

پیش روؤں کی عینک سے دیکھنے والے حضرات میرے ان خیالات پر چیں بر جبیں نہ ہوں غالب کی نکتہ چینی و عیب جوئی میرا مقصد نہیں میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کر رہا ہوں جو صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی اس لئے کہ غالب کی شخصیت اور فن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرکے کوئی ادیب یا نقاد یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول اکرام " غالب کے خیالات کے متعلق کوئی بھی نظریہ قائم کیا جائے اس کی تردید کیلئے بیسیوں اشعار مل جائیں گے "

لیکن اتنا تو سبھی تسلیم کریں گے کہ اعلیٰ شاعری وہی ہوتی ہے جو بلند خیالات کی حامل ہو اور سیدھی سادی زبان میں کی گئی ہو۔ اچھا شاعر اپنے سماج اور سوسائٹی کی عکاسی کرتا ہے اس لئے لازمی طور پر اسے سماج کے ہر فرقے کے مذاق کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے اور اس بات کا بھی احتیاط رکھنا پڑتا ہے کہ اس کی ہر بات جو شعر کا روپ دھارن کرتی ہے اسے سب لوگ سمجھیں اور اپنی عملی زندگی میں اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں ایک مشہور مغربی مفکر کلایو سینسم CLIVE SANSAM نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"POETRY IS A RHYTHMICAL FORM OF WORDS WHICH EXPRESSES AN IMAGINATIVE EMOTIONAL-INTELLECTUAL EXPERIENCE OF THE WRITERS, AND EXPRESSES IT IN SUCH A WAY THAT IT CREATES A SIMILAR EXPERIENCE IN THE MIND OF HIS READER OR LISTNER." (انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا جلد ۱۸)

سینسم کے قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کے خیالات چاہے کسی نوعیت کے بھی ہوں لیکن شعر میں ان کا اظہار کیا جائے تو اس طرح کہ عوام الناس اسے اپنے ہی خیالات سمجھیں اور اپنے ہی تجربات کی بات محسوس کریں اس کا مطلب یوں سمجھئے کہ شاعر اور عوام کے خیالات میں ایک حد تک یکسانیت ہونی چاہیئے۔ خیالات بھی عامی ہوں اور زبان بھی عامی ہو۔ شاعر کا کام صرف اتنا ہو کہ ان خیالات کو نقائص سے پاک کرکے ادبی رچاؤ کیساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دے۔ غالب کے یہاں خیالات کی بلندی تو ضرور مل جاتی ہے لیکن سادگی و صفائی کا لطف ہمیں ہرگز نہیں ملتا۔ اس نے الفاظ کے گورکھ دھندے بنانے میں خود کو اتنا منہمک کر دیا تھا کہ اس کی نظر میں سادگیٔ کلام کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات و افکار میں ضرورت سے زیادہ پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ غالب نے انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا تھا حیات و ممات کے راز بھی اس پر فاش ہوئے تھے لیکن دور دراز کی تراکیب اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال نے اس کی شاعری کے حسن کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

شاعری کیلئے صفائی و سادگی اور روزمرہ کی پابندی اولین شرائط ہیں۔ جو شعر میں حسن اور اثر

پیدا کرتی ہیں۔ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر غالب کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو پھر اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی مجھے اس امر سے قطعی انکار نہیں کہ غالب کی شاعری میں ایک مکمل فلسفۂ حیات ہے۔ اس کے عہد کے سماجی و تہذیبی حالات کی پوری عکاسی ملتی ہے۔ اس کی شخصیت بھی بڑی پیاری تھی سر والٹر اسکاٹ نے انگریزی کے مشہور فلسفی شاعر شیکسپیر کے متعلق کہا تھا کہ "وہ نایاب ترین چیز تھا" والٹر اسکاٹ کا یہ قول غالب پر بھی صادق آتا ہے اور شیکسپیر سے کچھ زیادہ ہی۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود بھی غالب ہر طبقے کا شاعر نہ بن سکا وہ ایک طبقے کا محبوب شاعر ضرور ہے لیکن یہ طبقہ چند معدودے سخن شناسوں ہی پر مشتمل ہے جو غالب کے دقیق اور پیچیدہ کلام سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شاعر کو دائمی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ جس سماج کا فرد ہے اس کے ماضی کو سامنے رکھ کر حال کا ایوانِ فکر تعمیر کرے، اور حال کے حالات کی روشنی میں مستقبل کا نقشہ مرتب کرے۔ میں غالب کی شاعری کا جب بھی مطالعہ کرتا ہوں مجھے اس پر شک ہونے لگتا ہے میری نظر میں غالب کی دوربینی و دور اندیشی قابلِ اعتماد چیزیں نہیں رہ جاتیں غالب کو شعر کہنا ضرور آتا تھا لیکن اس نے اپنے ہی عہد کے ذوق و رحجان کو سامنے رکھ کر شعر کہا اس نے سو سال بعد کے ہندوستان اس کے ماحول اور اس ماحول کے انسان کے ذوق و رحجان کا اندازہ نہیں لگایا اگر لگا سکتا تو شاید وہ اس قدر مشکل پسند نہ ہوتا۔ غالب کی مشکل پسندی ہمارے ذہن میں دو طرح کے سوالات پیدا کرتی ہے ایک تو یہ کہ کیا غالب قصداً مشکل پسند ہوا تھا؟ یا یہ کہ مشکل پسندی کی طرف مائل ہونے کے لئے وہ مجبور تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے قصداً ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اس کی غیر معمولی فارسی دانی، فارسی تراکیب سے بے انتہا دلچسپی اور فارسی لب و لہجے اس کی شاعری کو عام افہام سے بالاتر کر دیا۔ غالب اس سے بچنا بھی چاہتا تو اس کے لئے غیر ممکن تھا۔ مشکل پسندی اگرچہ کچھ غالب ہی تک محدود نہیں دلی کے دوسرے شعرا بھی اس زمرے میں شامل ہیں مثلاً ممنونؔ، مومنؔ اور شیفتہ وغیرہ کے یہاں بھی فارسی کی ثقیل اور غیر مانوس تراکیب ملتی ہیں لیکن ان شعرا کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ذہن پر تھوڑا زور دیجئے تو یہ آسانی سمجھ سکتے ہیں مگر غالب کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ذہن پر کتنا ہی زور ڈالئے آپ شعر کے حقیقی معنی تک پہنچنے سے قاصر رہیں گے۔ اس کے بیشتر اشعار کو پڑھتے وقت ذہن میں کئی معنی و مفاہیم ابھرتے ہیں جو آپ کے ذہن کو بھی منتشر کر دیتے ہیں اور بعض اوقات تو آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ غالب نے خود کوئی مستقل خیال یا مضمون اپنے اشعار میں نہیں باندھا بلکہ مشکل الفاظ کو بالترتیب جمع کر دیا ہے اور توازن و نغمگی پیدا کرنے کیلئے ردیف و قافیہ کا التزام برتا ہے اب بیچارے قارئین اپنی فہم و فراست کے مطابق تخیلی فضا میں جہاں تک پرواز کر سکتے ہیں کر کے معنی نکالتے ہیں۔ لیکن اس میں غالب بیچارے کا قصور بھی کیا تھا اس نے تو بارہا کوشش کی کہ وہ میرؔ کی صفائی و سادگی اختیار کرے۔ شاہ نصیرؔ کی وہ مقبولِ عام طرز بھی اپنائے جو اب استاد ذوقؔ کے حصے میں آئی تھی۔ بعض اوقات اس نے میرؔ و ذوقؔ کے انداز میں شعر کہنے کی کوشش بھی کی لیکن غریب غالب بری طرح ناکام رہا۔ ایسا

نہیں ہے کہ صرف ہمارے ہی عہد کے لوگ غالبؔ کی مشکل پسندی سے گھبراتے ہیں اس کے اپنے عہد کے لوگوں نے بھی اس کی مشکل پسندی کا گلہ کیا تھا جب عوام کی یہ شکایت غالبؔ کے گوش گذار ہوئی تو بجائے اس کے کہ غالبؔ اپنی کمزوریوں کو تسلیم کرتا جل بھن کر اس نے عوام کے سر سارا الزام عاید کر دیا کہ یہ لوگ بھی کتنے جاہل ہیں کہ شعر کو سمجھتے نہیں اور آسان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس بات کو اس نے یوں کہا ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　ہوتے ہیں ملول اس کو سنکر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ اگر غالبؔ کی شاعری میں اس طرح کے عیوب تھے تو اس کی شاعری کو اسقدر شہرت کیسے اور کیونکر نصیب ہوئی؛ اس طرح کے سوالات درست ہو سکتے ہیں دراصل غالبؔ کو جو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کے فن سے زیادہ اس کے شاہانہ ٹھاٹ، اس کی خاندانی فضیلت اور خاندانِ لوہارو سے اس کی نسبت کی رہینِ منت ہے۔ اس نے خود کو سلجوقی اور ایک خاندان کا روشن ستارہ جتا کر اس عہد کے امراء و امرا کے درباروں پر وہ دھاک بٹھا رکھی تھی کہ ہر شخص اس کا ترانہ پڑھنے لگا تھا۔ انگریزی حکام نے بھی عظمت کا سہرا اس کے سر پر باندھا اور اس وقت اس طرح کا انسانیت سوز اور مہلک اصول بھی رائج تھا کہ عزت و افزائش کے سارے مراتب اعلیٰ خاندان کے افراد ہی تک محدود ہوتے تھے اور ان ہی سماج دشمن عناصر نے غالبؔ کو عرشِ اعظم پر بٹھا دیا۔ سلطنتِ مغلیہ کے چراغ سحری نے بھی اپنی لو کے مطابق حیاتِ غالبؔ کو روشن و تابندہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے شعراء دا و یاروں نے بھی جن سے غالبؔ سے نہایت گہرے مراسم تھے اس کی شاعری کا چرچہ خوب خوب کیا۔ مولوی فضل حق خیر آبادی، ثم الدہلوی، مفتی صدر الدین آزردہ، عبداللہ خاں علوی، امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومنؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ اور غلام علی خاں وحشتؔ وغیرہ اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ جنھوں نے غالبؔ کو نیرِ اعظم بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ افسوس کہ اس ادبی سازش کا راز آج تک طشت از بام نہ ہو سکا کہ اصلیت کیا ہے ورنہ میرؔ کی آہ، اس کا — قلق، درد، ضبط، اضطراب، جدائی، تمنا، حسرت، ارماں، رنج، غم، سوز، داغ، خلش، تپش جو باوجود اس کے کہ میرؔ کی آپ بیتی کی دین تھی۔ لیکن میرؔ نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے جگ بیتی بنا کر شعر میں ڈھالا اور جس سادگی اور صفائی کے ساتھ اسے نبھایا یہ میرؔ ہی جیسے بیدار مغز اور قادر الکلام شاعر کا کام تھا۔ اگر میری نیک نیتی اور خلوص پر شک نہ کیا جائے تو میں مودبانہ عرض کروں گا کہ غزلگوئی میرؔ پر ختم ہو گئی اس کا مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ میرؔ کے بعد غزلگو شاعر پیدا ہی نہیں ہوئے۔ میرؔ کے بعد غزلگو شاعروں کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن اردو کی غزلوں میں وہ کیفیت کہاں جو میرؔ کے یہاں ملتی ہے اور یہی دل جیت لینے والی کیفیت غزل کی جان ہوتی ہے۔

ایک مفکر کا قول ہے ،۔

" اگر شاعری اپنے ذاتی تجربات اور انفرادی محسوسات کو اپنے مخصوص انداز میں
اس طرح بیان کردے کہ ہر پڑھنے والا اسے اپنی ہی بات سمجھے وہ شعر پڑھکر چونک
اٹھے اور ذرا دیر کو یہ محسوس کرنے لگے جیسے وہ شعر خود اسی نے کہا ہے تو یہی شعر کی
کامیابی کی دلیل ہے اور یہی اسکا اتمام "

اور یہ کیفیت میر کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے میر کے ہر شعر کو پڑھکر آپ چونک اٹھیں گے کہ اس میں آپ کے دل کی بات کیسے آگئی ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ " شاعری رنج و الم کی بہن ہے " یہ بڑی حد تک درست ہے اس لئے کہ رنج و الم کی کیفیت کی عدم موجودگی میں شعر بے اثر ہوجاتا ہے مشہور انگریزی شاعر شیلی نے خوب کہا ہے کہ :۔

"OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE
THAT BEAR THE SADDEST THOUGHT"

مسرتیں انسان کی زندگی میں شگفتگی کی ہر لہر دوڑا دیتی ہیں لیکن اس کے بول کو خشک اور بے اثر کردیتی ہیں اس کے برعکس رنج و غم اس کی آواز اور اس کے لب و لہجہ کو وہ سوز عطا کرتے ہیں کہ اس کا اثر دیرپا اور برکار ثابت ہوتا ہے نتیجہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ غم کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے غم کی اہمیت کا اقرار علامہ اقبال نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے ؎

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

ایک ایرانی شاعر کا قول بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

دلے بے غم گل بے آب و رنگ است — بہار گلشن آئینہ زنگ است

ان باتوں کو مدِ نظر رکھکر ذرا دیر کے لئے اردو شعراء پر ایک نظر ڈالی جائے تو میر اپنے آپ ہمارے اذہان میں آ کھڑا ہوگا۔ اس کے یہاں آرزو و کسک کا ایک ایسا الم انگیز امتزاج ملتا ہے جہاں پہنچکر انسان آہ ہی آہ بھرتا ہے ، واہ واہ کرنے کی فرصت اسے بہت کم ملتی ہے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ میر کی زندگی غم و الم سے ہمکنار تھی قدم قدم پر اس پر غم و الم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ چین کا ایک پل بھی اسے نصیب نہیں تھا اس نے خود اس حقیقت کا اظہار کردیا تھا ؎

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

غالب نے بھی اپنے غم زندگی کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے غم میں واقفیت نہیں ہے اس کا غم ہیں

ایسی خیالی دُنیا میں لے جاتا ہے جہاں سے ہم غم کے ایک ہلکے سے دھندلکے کے ساتھ واپس آتے ہیں جس کی زندگی ایک حباب کی سی ہوتی ہے جو پانی کی سطح پر تھوڑی دیر کے لئے اُٹھتا ہے اور پھر ایسا مٹ جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ میں نے غالبؔ کے غم کو خیالی کہا ہے ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہو میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ غالبؔ کا اُردو کلام اس کی عمر کے چھبیسویں سال تک کی یادگار ہے اور اس عمر تک غالبؔ کسی بڑی ذہنی الجھن کا شکار نہیں تھا وہ عیش و طرب کے مزے لوٹتا رہا شہزادوں کے ساتھ سرودِ زندگی میں مست غم و الم کی دنیا سے بے بہرہ تھا۔ بات غالبؔ کی تھی ضمناً میرؔ کا ذکر آگیا شاید کچھ لوگ یہ سوچیں کہ میرؔ و غالبؔ کا موازنہ کر کے میں میرؔ کو غالبؔ پر فوقیت دینا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں یہاں غالبؔ سے کسی شاعر کا موازنہ مقصود نہیں میرا مطلب صرف اتنا ہے ہمیں ہر بات کو غیر جانبدارانہ طور پر سوچنا چاہیئے، کسی چیز کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اس کی حقیقت و ہیٔت پر اچھی طرح غور و خوض کر لینا چاہیئے۔

یہاں تک میں نے غالبؔ کی اُردو شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا اب ذرا غالبؔ کے شخصی کردار سے کچھ بحث ہو جائے ابھی حال میں غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں "غالبؔ اور آہنگِ غالبؔ" کے عنوان سے بہت جامع کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مصنف یوسف حسین خاں ہیں، یوسف صاحب بہت سلجھے ہوئے ادیب ہیں ان کی ہر بات اور ہر رائے بڑی جچی تلی ہوتی ہے۔ اس سے قبل علامہ اقبال سے متعلق ان کی ایک کتاب "روحِ اقبال" میری نظر سے گذری تھی جہاں تک میں جانتا ہوں ہندوستان اور پاکستان میں اقبال پر جتنی تصانیف شائع ہوئی ہیں "روحِ اقبال" بعض خوبیوں کی وجہ سے سب میں منفرد مقام رکھتی ہے "غالبؔ اور آہنگِ غالبؔ" کی اہمیت کو بھی میں تسلیم کرتا ہوں لیکن اس کی بعض تحریروں سے مجھے اختلاف ہے، صاحب تصنیف ایک جگہ رقمطراز ہیں :-

> غالبؔ کے تین غم ایسے رہے جنھوں نے کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور
> ان کی زندگی میں رس بس گئے، جیسے وہ اس کا جز ہوں جسے الگ نہ کیا جا سکے
> وہ غم یہ ہیں ...... غمِ عزت، غمِ روزگار اور غمِ عشق"

غالبؔ کے دوسرے مداحوں نے بھی اس کی انسان دوستی، صلح کل، غمِ عزت اور غمِ روزگار کو سراہا ہے میں ان تمام بزرگوں کے اعلیٰ تحقیقی کارناموں کا دل سے قائل ہوں کہ انھوں نے غالبؔ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اس کے کردار کے بعض پوشیدہ پہلوؤں کو اُجاگر کیا لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے غالبؔ کے شخصی کردار کے عیوب پر روشنی ڈالی ہے اگر کسی نے اس مشکل کام کو انجام دینے کی جرأت بھی کی تو اس طرح کہ اس کے عیوب کسی طرح عیوب ظاہر ہی نہیں ہوتے بس شاعر کی معصوم فطرت کی لغزشیں اور

اس کی شوخیٔ مزاجی کا نتیجہ بتاکر ہمارے نقاد و محقق بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ غالبیات کے سلسلے کی پہلی تصنیف "یادگارِ غالب" میں غالب سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے بعد کی نسل نے انھیں خیالات کا تتبع کیا اور اس سے آگے بڑھکر کچھ سوچنے کی جرات نہ کی اور حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس میں جانبدارانہ پہلو زیادہ سمایا ہے ورنہ غالب کی زندگی سے بہتیرے ایسے واقعات منسلک ہیں جو غالب کو بلندی سے پستی پر لے آتے ہیں۔ غالب جس عہد کی یادگار ہے وہ انتہائی کشمکش اور انتشار کا زمانہ تھا ایک مستحکم نظام ارضِ ہند سے ہمیشہ کے لئے مٹ رہا تھا اور اسکی جگہ ایک نیا تخریب پسند نظام برسرِ اقتدار آ رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت جس نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستان کی ترقی کے تمام تر راستے کھولے ہندوستانی عوام کی معاشرتی و تہذیبی زندگی میں چار چاند لگائے اب اس کے سارے اختیارات چھینے جا چکے تھے۔ سامراجیت کے ناروا سلوک نے باشندگانِ برصغیر کے دلوں میں غم و غصہ اور نفرت و حقارت کی لہر دوڑا دی تھی۔ سب کی آنکھیں نمناک تھیں بدیسی راج کے تسلط سے سب سہمے ہوئے تھے اس وقت مسلمانوں کے دو باقاعدہ گروہ وجود میں آئے۔ ایک گروہ وہ تھا جو انگریزوں سے کسی طرح مصالحت کرنے کو تیار نہ تھا اس گروہ کے افراد اسلامی تہذیب و طرزِ زندگی کے والہ و شیدا تھے اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس گروہ کی نمائندگی اسلام کے ایک مایۂ صد ناز مجاہد سید احمد بریلوی ؒ کر رہے تھے۔ سید احمد بریلوی کی یہ تحریکِ جہاد کافی شدت پر تھی۔ اگرچہ اس تحریک کا آغاز انگریز دشمنی سے نہیں ہوا اس کے وجود میں آنے کے اسباب تو کچھ اور ہی تھے لیکن بعد میں اس تحریک نے اپنے نصب العین میں تبدیلی پیدا کرلی اور اب اس کا مقصد مسلمانوں کو مغربیت کے گمراہ کن اثرات سے محفوظ رکھنا ہوگیا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مغربی تہذیب کے گن گاتے اور مسلمانوں کو اس تہذیب سے ہم آہنگ ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ اس گروہ کی نمائندگی وقت کے ایک عظیم مصلحِ قوم سر سید احمد خاں کر رہے تھے۔ سید احمد بڑی جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس عہد کے بڑے بڑے مسلمانوں نے قدمے سخنے ان کا ساتھ دیا انھیں دنوں میں سید مرحوم نے "آئینِ اکبری" کی تصحیح کرکے غالب کی خدمت میں پیش کی اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ غالب اس پر تقریظ لکھ دیں غالب نے تقریظ نظم میں لکھی اور وہ نظم کیا تھی انگریزی تہذیب کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ۔ اس قصیدہ کو غالب کے مداح جو بھی کہیں میں اپنے طور پر اسے غالب کی موقع پرستی کی سب سے بڑی دلیل سمجھتا ہوں جس سلطنت مغلیہ نے غالب کو غالب بنایا

شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو فطری شاعر ہوتے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے ترقی کرتے ہیں ایسے شاعروں کو دوسروں کی ستائش کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی دوسرے وہ شاعر ہوتے ہیں جو فطری صلاحیتوں سے تو پر ہوتے ہیں لیکن ان کے خیال کی بے ربطی اور فکر کی کم مائیگی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے اس زمرے کے شاعروں کے لئے پروپگنڈہ کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے اس طرح کے شاعر شاعر ہوتے نہیں ہیں بلکہ بنائے جاتے ہیں۔

غالب کو میں اسی طرح کے شاعروں میں شمار کرتا ہوں) اس کے ستارۂ شاعری کو درخشانی عطا کی اور جب خود اسی سلطنت کا ستارہ غروب ہونے لگا تو بجائے اس کے کہ غالب اس سانحۂ عظیم پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا اس نے انگریزی تہذیب کی مدح و ستائش شروع کر دی اب اس کی نظر میں سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار جس نے اسے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ جیسے گراں بہا خطابات سے نوازا تھا قصۂ پارینہ کا ایک ہیرو بن کر رہ گیا تھا۔ غالب شاہ ظفر کے اس دلی زخم پر مرہم تو نہ ڈال سکا نمک ضرور چھڑکا جس سے زخم اور گہرا ہو گیا۔ غالب کا وہ قصیدہ جو اس نے مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر لکھا تھا یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ناظرین بھی اس کی نیت کے کھوٹ کو اچھی طرح سمجھ سکیں ؎

ایں کہ در تصحیح آئیں روئے اوست　　ننگ و عار ہمتِ والائے اوست

گر بدیں کاوش نگوئیم آفریں　　جائے آں دارد کہ جوئیم آفریں

صاحبانِ انگلستاں را نگر　　شیوہ و اندازِ اینیاں را نگر

تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

ایں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت　　سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت

داد و دانش را بہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتشے کز سنگ بیروں آورند　　ایں ہنرمنداں ز خس خواں آورند

تا چہ افسوں خواندہ اند اینان بآب　　دود کشتی را ہمی راند در آب

گہہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد　　گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد

نغمہ ہائے زخم از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند

ہیں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ　　در دو دم آرند حرف از صد کروہ

رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ　　شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است　　گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

مبداء فیاض را مشمر بخیل　　نور نیرو در طلب بازاں سبیل

چوں چنیں گنج گہر بیند کسے　　خوشہ زاں خرمن چرا چیند کسے

مردہ پروردن مبارک کار نیست　　خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

اس نظم کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ غالب کو کسی خاص تہذیب سے لگاؤ نہیں تھا وہ زمانے کا غلام تھا۔ وقت کے بہاؤ میں بہنا اس کی سرشت میں داخل تھا وہ ہر نئے ماحول کو اپنا بنا لیتا تھا ہر تہذیب

جو سر اٹھاتی دکھائی پڑتی تھی اس کا ترانہ گنگنانے لگتا تھا۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ مغربیت ہی کیا ہر نئی چیز سے ہماری وابستگی ہونی چاہیئے لیکن اسی حد تک کہ اس کی اچھائیوں ہی کو ہم اپنائیں ہم اس جدیدیت کو ہرگز نہیں تسلیم کریں گے جو ہمیں اپنی قدیم تہذیبی و معاشرتی روایات سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے "روایت سے بغاوت بھی ہو سکتی ہے لیکن روایت کے اسی پہلو سے جو ہماری مادی ترقی کے راستے میں حائل ہو نہ کہ اپنی پوری قدیم روایت سے۔ غالب کی مغربیت پسندی سے ہمیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ تو ہم خود چاہتے ہیں کہ دُنیا کی ایک عظیم تہذیب کی حیثیت سے ہم اس کا عمیق مطالعہ کریں اور اس کی ساری خوبیوں کو اپنی تہذیب میں پیوست کر لیں لیکن جب غالب ہماری قدامت پرستی کو اختلافی نظروں سے نہیں بلکہ حقیر نظروں سے دیکھتا ہے اور یہ کہتے ہوئے پایا جاتا ہے کہ "مردہ پروردن مبارک کار نیست" تو ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے اور نہ ہی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے خیالات و افکار میں اعتدال و توازن تھا۔ سر سید احمد خاں بھی مغربی تہذیب کے قائل تھے لیکن اپنے قدیم ورثے کے لئے بھی ان کے دل میں جگہ تھی اگرچہ جذباتی مسلمانوں نے انھیں اپنے مذہب و ملت کیلئے بہت بڑا خطرہ سمجھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اسلام اور مسلمان کے سب سے بڑے خیرخواہ تھے بات صرف اتنی تھی کہ وہ مسلمانوں میں جدید روشنی سے بھی دلچسپی پیدا کرنا چاہتے تھے غالب کے کردار کے ایک پہلو کو آپ کے سامنے پیش کیا اب ذرا دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالئے۔

۱۸۳۲ء میں اکبر شاہ ثانی نے اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاہا اس وقت بہادر شاہ ظفر ایک شاہزادے کی حیثیت سے چاہے مقبول عام نہ رہے ہوں لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے وہ علمی و ادبی حلقے میں اور عوام میں کافی مقبول ہو چکے تھے۔ ذوق ان کے اُستاد تھے اس لحاظ سے دربار میں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی خود بہادر شاہ ظفر کو بھی ان سے انتہائی عقیدت و انسیت تھی۔ غالب کی حریص طبع کو استاد ذوق کی یہ عزت بڑی ناگوار گذرتی چنانچہ اس نے ایک انتہائی مذموم چال چلی اس نے اپنے منظوم مراسلوں میں جو وہ اکبر شاہ ثانی کو لکھ کر بھیجا کرتا تھا اس میں اکبر کے ساتھ ساتھ شاہزادہ سلیم کی بھی تعریف کرنا شروع کیا سلیم ہی کے متعلق اس نے اپنے ایک قصیدہ میں لکھا ہے کہ ؎

زہے مناسبتِ طبع شاہزادہ سلیم   بہ فیضِ تربیت بادشاہ ہفت اقلیم

اس سے غالب کا جو مقصد تھا وہ ظاہر ہے۔ غالب کو معلوم تھا کہ اگر بہادر شاہ ظفر ولی عہد ہوں گے تو درباری انعام و اکرام عزت و افزائش سے وُہ محروم ہی رہیگا اور اگر دربار تک کسی طرح رسائی ممکن بھی ہوئی تو وہ مرتبہ نہ مل سکے گا جو ذوق کو مل رہا ہے اور اگر شاہزادہ سلیم ولی عہد منتخب ہو گئے تو پھر شاہی مراتب ذوق کی جگہ اسے ملے گا۔ اس لئے کہ سلیم کو وہ پہلے سے ہی خوش کر چکا ہے مگر غالب کا یہ خیالی قلعہ مسمار ہو گیا ان کا حسین خواب باوجود ہزار کوششوں کے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ سلیم کو ولی عہد بنانے کی تجویز ضرور رکھی

لیکن انگریزی سرکار نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہادر شاہ ظفر ہی ولی عہد بنائے گئے۔ اب لازمی طور پر غالب کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی پراگندہ چالوں سے ظفر و ذوق دونوں اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں بہت ممکن ہے کہ اس کے اثرات کچھ مضرت رساں ثابت ہوں۔ چنانچہ ایک بار پھر اس نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی وہ یوں کہ اس نے ظفر کی خدمت میں معذرت نامے بھیجنا شروع کر دیا۔ اپنے ان احباب سے جن سے ظفر سے خاصے مراسم تھے اپنی ندامت و شرمندگی کا اظہار کیا ان سے فریادیں کیں یہاں میں غالب کے ایسے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں جن میں کچھ اسی طرح کی باتیں ملیں گی ؎

خواہیم قرب شاہ و لیکن دریں مراد عبرت ز نامراد و لے سر گرفتہ ایم

پھر ایک دوسری جگہ لکھا ہے ؎

شہنشاہ زغم دوری درت کا دم بران رسیدہ کہ بے مرگ
کجاست از روش آلم نہ کرلیناہ قبول بہ لب سواد ہم از پائے بوس شاہنشاہ
بباد گہہ ز سم خانۂ مسیر خراب ندیم شہہ نشرم روئے روزگار سیاہ
چو سرکنم ز روش مدح گستری چو سزا بہ بزم خسرو گیتی ستاں نہ باشد راہ

آخر کار اپنے کچھ کرم فرماؤں کے توسط سے غالب نے دربار تک رسائی حاصل کی یہ تھے غالب کی زندگی کچھ واقعات ان کی روشنی میں غور کیا جائے کہ غالب کہاں تک انسان دوست تھا اور دوسروں کے مفاد کا وہ کہاں تک خیال رکھتا تھا صلح کل کا وہ طالب تھا اس کے لئے اس نے اشعار بھی بہت سے کہے لیکن وہ اپنے قول پر عامل کہاں تک تھا۔ غالب کو غم روزگار کا ہے کا تھا۔ زمانے نے اس کے ساتھ کیا ناانصافی کی اس کے عہد نے اور بعد میں آنے والے عہد نے غالب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اس کے ساتھ کسی طرح کی بے توجہی نہیں برتی گئی۔ غالب کے ساتھ اگر کسی نے ناانصافی کی کسی نے دھوکا دیا تو وہ خود اس کی ذات تھی اس نے اپنے کردار کو اس قدر گھناؤنا کر ڈالا تھا کہ لوگوں کی نظروں سے گر جاتا لیکن زمانے نے نہ جانے کیوں اس کے ساتھ یہ عظیم احسان کیا کہ آج ہم غالب کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

خواجہ شمیم الدین

غالب اور نئی نسل

غالب کا انتقال ہوئے ایک صدی کا عرصہ ہوچکا ہے۔ وہ ہندوستانی جنھیں اپنے سن شعور میں غالب کے دور سے سابقہ پڑا۔ آج اُن کی اولاد سنِ شعور کو پہنچ چکی ہے۔ اس نسل کی یادیں اور اثرات ابھی ایک صدی کے احاطے میں ہیں۔ اگر ہمیں اس نسل کے ذہن کا جائزہ کسی قدر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ لینا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ اس نسل کے اجداد کی افتادِ طبع اور حیاتیاتی تاثرات سے ابتدا کریں کیونکہ جدید عنوان کے تحت جن مسائل کو پیش کیا گیا اور کیا جارہا ہے۔ جن واردات اور کیفیات کی ترجمانی کی جارہی ہے۔ ان کی ابتدا غالب ہی کے زمانے سے ہوچکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہوا۔ مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم ہوا۔ پرانی وضع اور پرانا تمدن رفتہ رفتہ نیست و نابود ہوا۔ سماج کی کیفیات بدلیں۔ سیاست بدلی۔ اقتصادی حالت بدلی۔ یہ سارا ردوبدل اور یہ سارے مسائل کی نشوونما گزشتہ صدی میں ہوئی۔ غالب نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک سماج کو دم توڑتے اور دوسرے کو ابھرتے دیکھا۔ انھوں نے خود اپنا گھر اجڑتے دیکھا۔ اپنی دولت غیروں میں بٹتی دیکھی۔ عزیزوں اور دوستوں کی جانیں جاتی دیکھیں، جس کے نتیجہ میں انھیں اپنی عزت، اپنی دولت، اپنی اقتصادی حالت اور سماجی روایات خطرے میں نظر آئیں۔ اسی تذبذب اور اضطراری کیفیت میں ایک فیصلہ کن موڑ آ پہنچا۔ غدر ـــ جس نے حالات کو سمجھنے اور مصائب زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہن کو استوار کیا۔ تو اُس وقت کے انسان نے محسوس کیا کہ زندگی آنی جانی ہے اور زندگی کی ہر مسرت وقتی اور بے ثبات ہے۔ غالب کا ربط براہِ راست زندگی سے تھا۔ صغر سنی ہی میں باپ اور چچا کا انتقال ہوچکا تھا۔ جائداد کے جھگڑے، قرض کا مقدمہ، منصب کے حصول میں جدوجہد، غدر کی تکالیف، بھائی کی موت، اور پھر رفتہ رفتہ عرصۂ حیات کا تنگ ہونا۔ ان کی قسمت اسی طرح الٹتی پلٹتی رہی غرض یہ کہ وہ روئے اور خوب روئے، جی بھر کے زمانے اور زمانے والوں کا گلہ کیا۔ ان کا ذاتی امارت کا احساس خود ان کے لئے ایک مسئلہ بنا رہا۔ لہذا ان کے ذہن نے اپنے زمانے کی سرد و گرم اور فضا کی ساری مایوسی اور بے دلی اپنے اندر جذب کرلی تھی۔ انھوں نے بھرپور شعور کے ساتھ حالات کا مطالعہ کیا اور یہ بات ذہن میں آئی کہ اگر عزت اور سلیقہ کی زندگی گذارنی ہے تو نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔ انھوں نے زندہ رہنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ اپنی قدر افزائی اور منصب کے حصول کیلئے کیا کیا کوششیں نہیں کیں۔ کبھی ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل کی

تعریف میں قصیدہ لکھا۔ کسی عہدہ دار سے دوستی گانٹھی اور مدح کرنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر کے یہاں کسی طور رسائی حاصل کی۔ رامپور میں الگ سکہ جمایا۔ نوابانِ اودھ کے یہاں الگ زور لگاتے رہے۔ حیدرآباد قصیدے بھجواتے رہے۔ پھر بھی ان کی طبیعت سیر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ تک رسائی حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔ قدم قدم پر انھیں مایوسی ہوئی لیکن زمانے نے انھیں وہ مقام نہیں دیا جو اپنے ذہن میں متعین کر لیا تھا۔ لہٰذا حالات سے بددل بھی ہوئے ؎

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

تاہم وہ عزم و ہمت، جوانمردی اور حوصلہ مندی جو سپاہی زادوں میں ہوا کرتی ہے غالب کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ طبیعت نے راستہ بتایا اور حالات کا مقابلہ کرنے تیار ہو گئے۔ یہ ان کا خوشامدانہ رویہ نہ تھا۔ بلکہ دستار کا مسئلہ تھا اور وضعداری بھی نباہنی مقصود تھی ورنہ زمانے کے ہاتھوں پس جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ تھی حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت جو غالب کو شکست و ریخت پر آمادہ ہونے نہیں دیتی تھی اس شکست و اضطراب کے زمانے میں جب موجِ خون زمانے کے سر سے گذر رہی تھی۔ غالب نے دلوں کو گرمائے رکھا اور ایسی بصیرت عطا کی کہ زندگی کی تکلیفوں پر دل برداشتہ ہونے کی بجائے اس کو ایک حوصلے اور ہمت سے مقابلہ کرنے پر تیار کیا۔ انھوں نے تیرگیِ شام میں نورِ سحر کا جلوہ دیکھا اور اس طرح ہمیں ظلمت کو سہارنے کا اہل بنا دیا ؎

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
وائے دیوانگیِ شوق، کہ ہر دم مجھ کو آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

غالب نے ابھی اپنی آواز کی بازگشت بھی نہ سنی تھی کہ اپنی ہستی کے نظری انجام کو پہنچ گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں اور معنوی شاگردوں نے غالب کے پیام کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور وقت کے ساتھ بہتے ہوئے زندگی کی شاہراہ پر مستعدی سے گامزن رہے۔ ساتھ والوں کو "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" تلقین کی لیکن اس پر صحت کا طبعی انجام آ پہنچا۔ دادانے وطن اور معاشرہ کے آئینہ میں سب کچھ دیکھا تھا۔ بیٹے کے آئینہ میں کچھ اور رنگ جھلکنے لگے۔ اس کی زندگی جنگِ آزادی کی پیش گوئی کے ساتھ ختم ہوئی۔

نئی نسل نے آزادی کا نام لیا تو مروجہ اصولوں کو توڑ مروڑ کرنئے اصولوں کی تعمیر سے زیادہ تراجِ فطرت کی طرف واپسی اور جذبے کی بے لاگ پرستش پر زور دیا۔ انقلاب کا نام لیا تو انسانیت کی تمام تر اخلاقی مذہبی اور سماجی قدروں کی شکست و ریخت ضروری سمجھی اور اس پیغام پر تان توڑی ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اب پوتے کے پھولنے اور پھلنے کا زمانہ آیا۔ وہ دادا اور باپ دونوں کا ردِ عمل بن کر ظاہر ہوا۔ بظاہر موجودہ نسل کی زندگی باپ اور دادا دونوں کی زندگی سے زیادہ ہنگامہ خیز دَور سے گذر رہی ہے۔ مگر اسے اپنے سے پہلوں کی زندگی اپنے سے زیادہ ہنگامہ خیز نظر آئی۔ اسی لئے اُس نے سوچا کہ باپ اور دادا کو سکونِ قلب میسر نہ ہو سکا تھا۔ لہذا مسائلِ حیات پر غور کرنے کا موقعہ بھی نہ ملا۔ دوسری اہم بات یہ کہ قدیم نتائج کی شکست وزوال نے پرانی قدروں کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس لئے مجھے ہر بات پہ از سرِ نو غور کر کے نتیجہ نکالنا ہوگا۔ اس اندازِ تفکر نے بین الاقوامی مسائل کے ساتھ مل کر انفرادیت پرستی کو فروغ دیا۔ دوسری طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے نئی نسل کے ذہن کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ جہاں سائنس نے ہمیں بے پناہ علم وطاقت دی ہے۔ وہیں خاصے بڑے پیمانے پر عمومیت، آفاقیت اور یکسانیت بھی پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی بہت سارے خطرات، بہت سی الجھنیں، بہت سی مشکلیں اور بہت سے وسوسے بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ فرد پر جماعت کی آمریت لادی، یکسانیت کی خاطر انفرادیت کو مجروح کیا۔ اس نے ہلاکت کے ایسے آلاتِ حرب ایجاد کئے ہیں جس سے انسانیت کا مستقبل ہی مشکوک نظر آنے لگا ہے۔

ان حالات میں اس کے سامنے صرف اپنی ذات کی از سرِ نو تلاش میں ان مسائل کا حل نظر آنے لگا ہے۔ ذات کی اس تلاش میں اس کے نزدیک ظواہر سے زیادہ اس کے اندرونی کیفیات اہمیت رکھتی ہیں۔ غالب کے یہاں بھی یہی ذہنی کیفیت نظر آتی ہے۔ ذرا سی محنت سے اس طرح کے کئی اشعار مل جائیں گے۔ دو تین تو یہ حاضر ہیں ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں، ابھی راہبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

نیا ذہن بھی غالب کی طرح حساس ہے اور ایک معصوم بچے کی حیرت، خوف اور جستجو کا عکاس ہے۔ آج کا نوجوان اپنے میں اطمینان محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس کے باطن میں جو الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں اسے پریشان کئے رکھتی ہیں۔ سماج کی گروہ بندی، مذہبی عقائد کی بندشوں اور روایت سے رشتہ کا ڈھیلا ہونا نئی نسل کے لئے شکست خوردگی بیزارگی اور اکتاہٹ کا سبب بنی ہے۔ موجودہ زمانے میں مذہب سے بیزاری وضعِ قدیم سے دشمنی، اخلاق سے آزادی، جذبات کے اظہار میں بے باکی، سیاسی بے چینی، تحریکِ اشتراکیت، سرمایہ داری، صنعت وحرفت، یورپ کی کورانہ تقلید، عریانی اور بے حیائی کی ترغیب، جنگِ سابق اور حال سے زندگی کی دشواریاں۔ ایسی کتنی باتیں ہیں جن سے ہماری زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہو رہا ہے۔ انھیں کے زیرِ اثر نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے آج کا نوجوان اعصابی تناؤ میں گرفتار ہے جس نے فکر وخیال کی مرکزیت اور دماغی سلجھاؤ کو چھین لیا ہے۔

سربرآوردہ مفکرین کا خیال ہے کہ مذہب کا سب سے بڑا کام انسان کے قوائے ذہنی اور عملی کی تہذیب و تشکیل اور روک تھام ہے لیکن انسان عجیب تضاد سے مرکب ہے۔ جنگ، بے امنی، افلاس، قحط اور مصائب جہاں خدا کو یاد دلاتے ہیں۔ خدا سے برگشتہ بھی کرتے ہیں۔ نئی نسل نے ان سارے مصائب کا سبب خدا اور مذہب کو قرار دیا اور علاج تجویز کیا خدا کا دیس نکالا کیا جائے۔ انسان میں خدا اور مذہب سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہو جانے کے بعد سماج سے باغی ہو جانا اور رسم و رواج، روایت اور اخلاق سے آزاد ہونا سہل ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں اس خیال کی کارفرمائی نسائیت کو ختم کرتی ہے۔ شرم و حیا، عفت و عصمت کی بندشوں کو توڑ دیتی ہے۔ نئی نسل کے مردوں اور عورتوں کے اخلاق و اعمال نمایاں طور پر اس تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جو عزت و آبرو سے بے پروائی نفس و ہوس کی شعلہ انگیزی اور تمام اعمال حسنہ کی تباہی میں اعانت کرتی ہے۔ اس نسل کے سامنے زندگی بحیثیت مجموعی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ یعنی جنسی اشتہا کی تسکین کیونکر ہو بقول غالب ؎ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں — ہو تو کیونکر ہو — نئی نسل سرے سے خدا کو مانتی ہی نہیں اور مانتی بھی ہے تو اس کے پاس کسی دینیات یا مسلک کے بغیر خدا یا مذہب کا عقیدہ ہے جس طرح غالب کا عقیدہ تھا کہ ؎

وفاداری بہ شرط استواری، اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں، تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

جبکہ نئی نسل خدا کو مانتی تو ہے مگر کسی دینیات یا مسلک کے بغیر تو پھر اس کے پاس نہ کوئی ایسا عقیدہ رہا جو اپنے اعمال کی تشکیل کر سکے اور اپنے افعال کو معنی و مقصد دے سکے۔ اسے کوئی پیام سے دلچسپی نہ رہی اور پھر رومانی فلسفوں کی طرف سے شک و شبہ کے ساتھ ساتھ آج کی نسل سائنس کی تخریبی ترقی سے خوف زدہ اور سائنس سے بھی مشکوک ہونے لگی ہے۔ ان حالات میں اس کے سامنے اپنی ذات کی از سرِ نو تلاش میں ان مسائل کا حل نظر آنے لگا۔ ذات کی اس تلاش میں اس کے نزدیک ظواہر سے زیادہ اسکی اندرونی کیفیات اہم ثابت ہوئیں۔ اس نے کائنات کو سمجھنے کی بجائے اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنا ذاتی تجربہ بھی عزیز ٹھہرا۔ اور چونکہ ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لئے ان کے کئی ایک تجربات بھی بالکل نئے ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے تجربات کے اظہار کے لیئے انھیں زبان اور انداز بیان بھی عام ڈگر سے ہٹ کر اختیار کرنا پڑیگا۔ یہیں پر ایسے شاعر کو جو اپنے فن کو اظہارِ ذات کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے نئی زبان تخلیق کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ غالب کی شاعری بھی چونکہ اظہارِ ذات کا ذریعہ ہے۔ اس لئے انھیں بھی یہی کچھ کرنا پڑا چنانچہ انھوں نے اپنی الگ ڈکشن بنائی۔ مروجہ اصول و ضوابط کو رد کیا۔ علامتی اظہار کو اپنایا۔ اور سماج کی مطلق پرواہ نہ کی۔ ان کی یہ روایت سے بغاوت

سماج اور مذہب دونوں کو ناگوار گذری۔ دوسرے ان کے اس طرز تفکر کی وجہ سے وہ عام فہم بھی نہیں رہے تھے لہٰذا ان پر کھلے بندوں مشاعروں میں چوٹیں بھی ہونے لگی تھیں۔

جدید ادب کے عنوان سے جو کچھ بھی پیش کیا جارہا ہے۔ اس پر بھی اسی قسم کی چوٹیں ہو رہی ہیں کہ جدید ادب شخصی اور نجی اسرار ہے۔ یہ فرد کی تنہائی کا عکس ہے۔ یہ بے ربط سلسلۂ خیالات ہے اور اس میں مرکزی تصور نہیں ہے اس قسم کی کئی باتیں ہیں جو سننے میں آتی ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ جدید ادب عام فہم نہیں ہے، لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ ایسا کہنے والوں نے نئے ذہن کا مطالعہ حالات کے پس منظر میں نہیں کیا۔ آج یہ بات ہم فخریہ کہہ دیتے ہیں کہ غالب کو ہم نے سمجھا ہے۔ ہم نے ڈسکور DISCOVER کیا ہے۔ لیکن اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ غالب کو سمجھنے کے لئے ہمیں غالب کی زندگی اور ان کے زمانے کے سرد و گرم کو انگیز کرنا پڑا تب جا کے غالب کے خیالات تک ہماری رسائی ہو پائی ہے۔ غالب کے زمانے نے غالب کے ذہن کی اجزائے ترکیبی کا مطالعہ نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے غالب کی ذہنی دنیا کی بہ نسبت عصری شعور کے نئی نئی اور اجنبی سی محسوس ہوئی۔ زمانے نے شکایت اس لئے کی تھی کہ غالب کے کہنے کا طریقہ دوسرا تھا اور لوگوں کے سمجھنے کا طریقہ دوسرا سخن بیانی کا رنگ الگ اداء سخن نہی کا ڈھنگ جدا تھا۔ لیکن پھر بھی غالب نے اپنے زمانے سے بھی بہترین قدر حاصل کی۔

غالب کا شعر ہمیں سکون نہیں دیتا بلکہ ایک قسم کی بے چینی و کرب اور جستجو و عمل کی دعوت دیتا ہے زندگی جیسے جیسے ہمارے برتنے میں آتی ہے ہمارے ذہن میں اس کے معاملات اور مسائل کے بارے میں سوالات ابھرتے ہیں اور ہم اپنے طور پر اپنے احساسات کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ہمارے لئے بڑا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ غالب نے ہمارے سامنے زندگی اور کائنات کے بارے میں سوالات رکھے ہیں اور ان پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ جیسے ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ‌ ‌ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے ‌ ‌ نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ‌ ‌ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ اور اس قسم کے کئی سوالات ہیں جن پر غالب نے خود غور کیا اور ہمیں غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ غالب نے نئے زمانے اور نئے نظام کی اس وقت تائید کی تھی جبکہ سرسید کو بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت میں جو غیر معمولی دلآویزی ہے وہ ان کی انسان دوستی اور انسانی حیات کے مسائل اور الجھنوں کے بے باکی سے اظہارِ بیان میں ہے۔ جن میں برق کی سی تندی اور سیماب کی سی بیقراری موجود ہے۔ ان کے کلام میں نظریات، رجحانات اور محسوسات کی رنگا رنگی ہے۔ اظہارِ بیان کے لئے غیر مشروط خلوص اور سچائی کو اپنایا ہے۔ جس کے لئے نہ تیور اور ضوابط کی بھی پرواہ نہیں کی اور حالات کے مقابلہ میں برابر ڈٹے رہے۔ یہاں تک کہ شکلیں اتنی

پڑیں اُن پر کہ آساں ہو گئیں۔ انھیں جب آسمان کی رات دن گردش کا یقین ہو گیا تو کچھ نہ کچھ ہونے سے گھبرانا بھی ترک کر دیا۔ جذباتِ عشق کی ترجمانی میں انفرادیت بھی ہے اور تیکھا پن بھی ہے۔ "ستم ہائے روزگار" سے بس جانے کے باوجود محبوب کی یاد سے بیقرار رہے۔ ان کی طبیعت نے عشق سے زیست کا مزا بھی پایا۔ اور انھوں نے عشق کو خلل دماغ بھی کہا۔ عاشقی کی تو سراپا نیاز بھی رہے اور عاشقانہ پندار بھی قائم رکھا۔ رقیب کو طعنے بھی دیئے اور محبوب کے شوقِ دیدار میں اس کے در پر سر کے بل بھی گئے۔ عشق کے اعلیٰ معیار کو بھی پیش کیا اور معاملہ بندی پر آئے تو [illegible] نیچے۔ مصائبِ زندگی کا مقابلہ کیا۔ رنجیدہ بھی ہوئے اور سینہ سپر بھی رہے۔ غرض یہ کہ غالب فطرتِ انسانی کے ہر جذبے سے اسی قدر متاثر ہوئے جتنا ایک حساس شخص اس سے ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کا آدمی ان کے کلام سے یکساں طرح محظوظ ہوتا ہے۔

● نئی نسل اور غالب میں یہ قدریں مشترک ہیں۔ ان میں خطر پسندی اور بے باک طوفانی جذبوں سے محبت کرنے کا رجحان ہے۔ زندگی کے معاملات اور حقائق تک رسائی APPROACH قریب قریب دونوں کے یہاں یکساں ہے۔ زندگی کی نبض پر غالب کی بھرپور گرفت تھی۔ نفسیاتی حقائق ان کے پیشِ نظر تھے۔ انھوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ حیات کی ترجمانی کی بلکہ دائرہ حیات کو وسیع تر کیا اور بے جان اشیاء میں بھی زندگی دیکھی انسان کو لامحدودیت سے ہمکنار کیا۔ گویا غالب نئی نسل کے روپ میں آج بھی زندہ ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب کی قدر اس لئے ہوتی ہے اور اُس وقت ہوتی ہے جب زمانہ اُس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے یا اس کے خیال کے مطابق سوچنے اور سوچنے لگے۔ نئی نسل کے خیالات اور اعتقادات کچھ ایسے بدلے کہ تقریباً وہی ہو گئے جو خود غالب کے تھے۔ نئے زمانے کا معیارِ شعری بدلا۔ غلو اور مبالغہ کو ترک کیا گیا۔ لوگوں نے واقعات اور موجودات سے قریب تر رہنا شروع کیا۔ تقلید کو ترک کیا۔ اظہار کی جدتیں، نئے نئے اسلوب اور طرفگیٔ ادا پر زور دیا گیا۔ آزادیٔ افکار، خدا اور مذہب کا مضحکہ، جنت اور دوزخ پر ہنسنا۔ معاملہ بندی کی اعلیٰ مثالیں، مادیت سے لگاؤ غرضیکہ تمام تر خیالات و اعتقادات جو غالب کے تھے وہی نئی نسل کے ہیں۔ لہٰذا غالب کا مقبول ہونا ایک فطری عمل ہوا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے سو سال کے بعد بھی غالب کو زندگی بخش دی اور وہ نظریاتی اعتبار سے نئی نسل کے روپ میں زندہ ہیں۔

غلام رسول

اُردو املا میں مرزا غالب کا اجتہاد

ہر زبان کے لیئے املا کے قاعدے نہایت ضروری ہیں، تاکہ لکھاوٹ کے ذریعے اُس کے الفاظ کا صحیح تلفظ اور اس کی عبارت کا واضح مطلب ظاہر ہو سکے۔

پرانی مکتبی تعلیم میں املا کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی، صرف انشا پردازی پر زور تھا۔ انشا کے علاوہ خطاطی کی بھی تعلیم ہوتی تھی، اس کی بڑی اہمیت تھی۔ "الخط نصف العلم" سمجھا جاتا تھا۔ سرکاری مدارس میں املا کی مشق کتابوں سے کرائی جاتی تھی۔ مگر اس کے کوئی قواعد مقرر نہ تھے۔

میرے علم کی حد تک سنہ ۱۹۱۲ء میں اُردو املا کی تعلیم کا پہلا سلسلہ کتابی صورت میں سب سے پہلے سابق صوبۂ پنجاب کے شہر لاہور سے شائع ہوا، جس کو پیرزادہ محمد خلیل الرحمان خاں نے "اُردو املا" کے نام سے پانچ حصوں میں مرتب کیا اور عطر چند کپور اینڈ سنز نے چھاپا۔ ان کتابوں کو محکمہ تعلیم صوبۂ پنجاب نے منظور کیا تھا۔ اس سلسلے میں اردو حرفوں کے جوڑ، مرکب الفاظ لکھنے کی ترکیب اور شکستہ خط کا استعمال ان سب کو مشقوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لکھنے کے متعلق ہدایتیں بھی درج ہیں۔ ممکن الوقوع غلطیوں کی اصلاح کے لئے جابجا اشارات و نکات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا کتابچہ نہایت کار آمد تھیں اسلئے اربابِ تعلیم اور تعلیم یافتہ لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ برسبیل تذکرہ یہ اظہار کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس کمترین نے بھی ایک کتابچہ اردو املا کے نام سے لکھا تھا جسے ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے اور ایک مضمون اسی عنوان سے ہماری زبان بابت یکم اگست ۱۹۵۵ء میں لکھا۔

نواب میر عثمان علی خاں بہادر مرحوم کے دورِ حکومت میں سررشتہ تعلیمات میں مدارس کیلئے اُردو کتابوں کی تالیف و تدوین کی اسکیم تجویز ہوئی۔ انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی جانب سے اس کام کا سر انجام کرنا طے پایا۔ ایسے موقع پر مولوی عبدالحق مرحوم معتمد انجمن مذکور نے سب سے پہلے اُردو املا کے قواعد منضبط کرانا چاہا اور یہ کام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ کے سپرد کیا۔ موصوف نے اردو املا کے بارے میں اپنی تجویزیں انجمن کے سامنے پیش کر دیں۔

کچھ عرصے بعد اردو والوں کی عام سہولت کے لئے آپ نے ایک بسیط مضمون "اُردو املا"

کے عنوان سے رسالۂ ہندستانی الہ آباد بابت جولائی ۱۹۳۸ء میں لکھا جس میں شرح و بسط سے اُردو املا پر بحث کی گئی ہے۔ تعلیم یافتہ حلقے میں اس کا خوب چرچا ہوا لیکن مشاہدہ ہے کہ باوجود علم و اطلاع کے اُردو کتابت میں اُس کی پوری پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ چنانچہ کتابوں اور اخباروں میں بعض صورتوں میں اس کی نہج ہی جاری ہے۔ اُردو کو ترقی یافتہ زبان بنانے کے لئے اس کی طرف پہلے توجہ کرنی چاہیئے۔

مرزا غالب کے زمانے میں اُردو کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، کیونکہ وہ دور پہلے ہی سے فارسی کا تھا۔ اُس کا چلن سرکار دربار اور خواص میں تھا۔ ایسے وقت میں غالب نے اُردو جیسی بے مایہ زبان کی شاعری میں جدّتِ مضامین، طرفگی خیالات، نئی تشبیہوں، استعارہ و کنائے کے استعمال، شوخی و ظرافت اور ذومعنی اشعار کا استعمال کر کے اس کو مالامال کیا۔ فی زمانہ چار دانگِ عالم میں اپنی ذات سے اُردو زبان کو عزت بخشی اور اُسے شہرت دی۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی اُن کا ایسا کارنامہ ہے۔ جس کی وجہ سے وہ نثر نگاروں میں صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں۔ نثر نگاری میں ان کے خطوط انشا پردازی کا لعلِ شب چراغ ہیں۔ ان کی سادہ اور بے تکلف نثر ایسی ہے جس میں وہ منفرد ہیں۔ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جہاں نثر نگاری میں انفرادیت پیدا کی، وہاں اُردو کی کسمپرسی اور ناقدری کے زمانے میں اپنی عقل و فہم اور جودتِ طبع سے اردو املا میں اپنی جدّت طرازی کا ثبوت دیا۔[1] چنانچہ اردو املا کی بابت بعض اصول ایسے اختیار کئے تھے، جو آج بھی اردو دنیا میں مسلّمہ سمجھے جاتے ہیں اب ان کی صراحت نیچے کی جاتی ہے۔

۱۔ **ذیا ز**۔ ذ کو غالب عربی سمجھتے تھے اور ز کو خالص فارسی۔ مثلاً گزشتن (فارسی) کاغذ (عربی)، فارسی اور اُردو لفظوں میں ز کی جگہ ذ لکھنا غلط قرار دیتے ہیں

۲۔ **الف یا ہ**۔ عالمگیر[1] اور انشا[2] کے مانند، جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہ ہو ان کو (ہ) کی بجائے الف سے لکھنا پسند کرتے تھے مثلاً۔ مہیا

۳۔ **واو یا نون غنّہ**۔ بعض لفظوں کی لکھاوٹ میں نون غنہ کے برخلاف صرف واو لکھنا جائز سمجھتے تھے مثلاً پاؤں کی جگہ پانو اور گانوں کی جگہ گانو وغیرہ ہو کر ان میں واو کے بعد نون کی آواز ادا نہیں ہوتی ہے اسلئے آخر میں نون لکھنا مہمل بات ہے۔

(باقی سلسلہ ص۷۲ پر)

---

[1] دیکھو۔ پنجاب میں اُردو از محمود شیرانی۔ ص (مقدمہ ح) [2] دیکھو۔ دریائے لطافت از انشا۔ ص (۳۵۶)

قیوم صادق

مرزا غالب کی موجِ زیست

مرزا غالب کی شاعری میں رمزی کیفیات کی بہتات ہے جن میں لفظ "موج" کا ذکر یہاں مدنظر ہے۔ لفظوں میں تصور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر تصور اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے جو ہمیں ایک مخصوص ماحول میں لے جاتا ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک طلسمی عنصر رکھتا ہے اور اگر شاعر اس طلسم کا رمز آشنا ہے تو اس کے اشعار میں ایسی طلسمی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو اپنے اندر معانی کے خزانے چھپائے ہوئے ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے　　　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

لفظ آوازوں سے تعبیر ہے۔ لیکن آوازیں عجیب انداز میں خیال سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور اس طرح خیال کے حُسن میں دوچند اضافہ ہو جاتا ہے۔ الفاظ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ کی بحث سے الگ اپنا منفرد وجود رکھتے ہیں وہ اپنے استعمال کرنے والے کے تابع ہیں۔ لیکن چونکہ زبان کا ہر لفظ زندگی میں کسی نہ کسی افادی عمل غیر معنی کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے چاہے شاعر اسے رمز و علامت کے طور پر ہی استعمال کرے اس کا افادی پہلو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

بجنوری غالب کی شاعری کی جو قدریں مقرر کرتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں ان کا بیان جستہ جستہ ہوا ہے۔

"مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔"

"زبان اوضی ہے اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں۔"

فنون لطیفہ میں خوش نگاری کو فنِ تعمیر سے سب سے زیادہ مشابہت ہے۔ الفاظ وہ خشت و گل چوب اور آہن ہیں جن سے ادبیات کی عمارت عبارت ہوتی ہے۔

زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں"

جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے ہر جان اپنا جسم خود بہم پہنچاتی ہے۔ غزل میں رمز و ایہام کی یہ کیفیات جس انداز میں ملتی ہیں کسی دوسری صنف میں نہیں ملتیں۔ شاید اس لئے کہ بات کو ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دینے سے جو تاثر پیدا ہو جاتا ہے برملا کہہ دینے سے نہیں ہوتا۔

غالب کے شاعرانہ لب ولہجہ کی گرمی، جوش اور قوت کے ابلاغ کا پہلا ذریعہ تو الفاظ ہیں جنہیں اپنے خیالات کے خارجی اظہار کے لئے وہ بروئے کار لاتے ہیں اور جس سے ان کے لب ولہجہ پر بھی روشنی پڑتی ہے غالب کی لفظیات اور تراکیب کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ایک بات جو سب سے نمایاں نظر آتی ہے اور جس کا ذکر ان کے اشعار میں بار بار آتا ہے۔ وہ گرمی، تندی وتیزی، جلن، سوز، آتش، حدت اور جلا دینے والی چیزوں کا بیان ہے جن سے ان کے افکار، جذبات اور خیالات کی شدت اور جوش وگرمی کا شدید احساس ہوتا ہے اور جس سے ان کی ذہنی مرغوبات اور نفسیاتی کیفیات کا بھی سراغ لگایا جاسکتا ہے، کیونکہ کسی شاعر یا ادیب کے تکیہ ہائے کلام سے اس کے ذہنی وشعوری اور نفسیاتی پہلوؤں کے سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے اس لئے کہ یہ الفاظ اور تکیہ ہائے کلام اس کی باطنی کیفیات کے پرتو ہوتے ہیں، جو ایک خارجی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور انہیں سے ان کے لب ولہجہ کی خصوصیات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے مثلاً غالب کے ہاں ان الفاظ وتراکیب کا مذکور آپ کو بار بار ملے گا۔ آتش زیر پا، موئے آتش دیدہ، آتش خاموش، نفس جانگداز، برق سوزِ دل، شعلہ جوالہ، خون آب سوزشِ دل، دیدۂ خونابہ فشاں، نالہ ہائے شرر بار، جلوہ زار آتش دوزخ، تندئ صہبا، آتش بجان، مغنی آتش نفس، جلوۂ برق فنا، سوز غمہائے نہانی، محشرستان بے قراری، خلش غمزہ خونریز، اور بالخصوص کلام غالب میں سوز، آگ، بجلی، خون، اور سرخ رنگت کا ذکر شاید سب چیزوں سے زیادہ ملے گا۔ جس سے ان کے لب ولہجہ میں گرمی، جوش، تندی وتیزی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کے اشعار سے جو (IMAGERIES) یعنی لفظی تصویریں ابھرتی ہیں وہ بھی قابل توجہ ہیں جن سے شاعری کی شخصیت کے اس پہلو پر خاص روشنی پڑتی ہے جس نے اس کے لب ولہجہ کے ابلاغ میں یہ صورت اختیار کی اور یہ امر بھی غور طلب ہے کہ الفاظ وتراکیب کا یہ انداز اردو شاعری میں ان سے پہلے کہیں نظر نہ آئے گا۔ جس سے اس بات کا ثبوت ہمیں پہنچتا ہے کہ ہر بڑا شاعر اور فنکار جذبات اور لب ولہجہ کے ابلاغ کے لئے زبان والفاظ بھی اپنے مخصوص انداز میں استعمال کرتا ہے جو اس کی انفرادی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔

غزل نگاروں نے متعدد ایسی علامتی رمزی رعایتوں کو بطور شعری محرک کے برتا ہے، جیسے رنگ وبو، جنون، گریباں، قفس، آشیاں، زنجیر وموج وغیرہ۔

"موج" کی حرکت، بیتابی اور بے یقینی تغزل کی رمز نگاری میں مختلف پیرایوں میں ملتی ہے۔ کہیں موج بہار کہیں موج رنگ، کہیں موج گل اور کہیں موج سراب اور کہیں صرف موج بطور استعارہ شعری محرک کا کام دیتی ہے۔ میر اور سودا نے اپنے اپنے انداز میں موج کے شعری محرک سے کام لیا ہے۔ کہیں غالب کے یہاں

خاص کر لفظ "موج" کی تشبیہیں کثرت سے ملتی ہیں گُل کی خونین نوائی سے رنگ کی تعبیر کرتے ہیں ؎

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا　　　اے وائے نالۂ لبِ خونین نوائے گل

اس طرح محبوب کی رفتار کے ذکر میں موج کی دل نشیں تشبیہ ملاحظہ ہو: اس کی رفتار گل‌فشاں طراز ہے ؎

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا　　　موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

ملاحظہ ہو:- نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　　حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

جس طرح موجِ آب آگے نکلنے کی غرض سے ابھرتی ہے اسی طرح میرا نقش قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے　　　کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ایک زمانہ تھا کہ مجھ کو چمن سے بہت دلچسپی تھی لیکن اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ بوئے گُل سے بھی میرا دل بیزار ہے اور میں اس سے گھبراتا ہوں۔ انقلاب زمانہ سے محبت نے نفرت کی صورت اختیار کر لی ؎

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا　　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ان کی محفل میں فرش سے لیکر عرش تک عیش و نشاط کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور یہاں محض جلنا ہی جلنا ؎

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال　　　ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

مجھ سے دشتِ وفا کا حال نہ پوچھو۔ وہ تو موجِ سراب کی طرح مہلک ہے اور پیاسے (دوستار پرست) کو دھوکہ دے کر ہلاک کر دیتا ہے یوں سمجھ لو کہ دشتِ وفا کا ہر ذرہ جوہرِ تیغ　آب دار ہے بھلا دشتِ وفا میں گامزن ہو کر کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وفا جان لئے بغیر نہیں رہتی ؎

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے　　　تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

صورت ہی دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ وہ شراب نہ دے تو کیا شکایت، جذبۂ عشق کی وجہ سے ہمارا سانس دریائے بیخودی کی موج ہے ؎

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار　　　یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

یہ میکدہ (چشم) شراب (خونِ دل) کی جستجو میں (خاک بسر) غبار آلود ہے۔

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　　آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

ردیف "موجِ شراب" کی پوری غزل اس کی آئینہ دار ہے۔

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موج شراب

غالب نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے کہ:-

ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگ مرمر کے حوضوں میں بھر دیئے جاتے ہیں آفتاب کی تیزی سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے اس وقت نوعمر لڑکے ان حوضوں میں اتر کر انگوروں کو پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی منہ بند صراحیاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی صراحیوں کو بطِ مے کہتے ہیں۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

خون خلق گردن مینا پر ثابت ہوا۔ کیونکہ اسی میں وہ شراب تھی جو خونِ خلق کا باعث ہوئی پس اسی بنا پر اب شراب صراحی میں لرز رہی ہے۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج گردِ ساحل ہے بزخم موجۂ دریا نمک

اصلی خیال یہ ہے کہ میرے محبوب کا توسن موج دریا سے بھی زیادہ تیز خرام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اڑائی ہوئی گرد نے موج دریا کے زخموں پر نمک چھڑکا یعنی اس کو رشک پیدا ہو گیا کیونکہ دریا کی رفتار میں یہ زور شور اور روانی نہیں۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہر موج ایک جال ہے اور اس کے جال کا ایک ایک حلقہ "صد کام نہنگ" کا بنا ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ ایک ایک موج میں سینکڑوں مگرمچھ منہ پھاڑے ہوئے ہیں۔ ایسی خطرناک حالت میں دیکھئے قطرہ کے موتی بننے تک کی مدت میں اس پر کیا کیا آفتیں آتی ہیں۔ بقول حالی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ساقی کو اس بات پر بہت غرور تھا کہ وہ شراب پلانے میں بڑا فیاض ہے لیکن میں اس قدر قلزم آشام نکلا کہ میری بلا نوشی سے اس کا غرور ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی صراحی منہ میں موجِ شراب کی رگِ گردن بھی مگر غرور و تکبر کی نشانی تھی آج نظر نہیں آتی گویا ساقی کے غرور کے ساتھ شیشے کا غرور بھی ٹوٹ گیا۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اگر ترے دل میں یہ خیال ہے کہ وصل سے عشق میں کیونکر کمی ہو جاتی ہے تو موجِ بحر کو دیکھ وہ زبان حال سے بتا رہی ہے کہ وصل سے شوق اس طرح زوال پذیر ہوتا ہے یعنی موجِ کے تموج اور تلاطم سے معلوم ہوتا ہے

کہ موج وصل بحر سے دل سیر ہوگئی ہے اور وہ واپس کنارے پر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

نہ اتنا برّشِ تیغ جفا پر ناز فرماؤ مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

آپ اپنی تیغ جفا کی برّش پر اتنا ناز نہ کریں۔ میرے نزدیک آپ کی تیغ جفا کی برّش معمولی چیز ہے کیونکہ میرے دریائے بیتابی میں یہ برّش ایک موج خوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی وہاں ایسی سیکڑوں موجیں تلملا رہی ہیں۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

چونکہ زندگی کی کشاکش سے کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا اس لئے سعی آزادی فضول ہے، اس کے ثبوت میں یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ موج آب کو دیکھئے۔ ظاہراً طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روانی آزادی ہے لیکن اگر بہ نظر غور دیکھیں تو وہ آزاد نہیں بلکہ وہ اپنی روانی ہی کی وجہ سے پابند ہے کیونکہ موج کی روانی زنجیر کی صورت پیدا کرتی ہے اور جس پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہو اس کو آزاد نہیں کہا جاتا۔ پس معلوم ہوا کہ موج گرفتار ہے اور وہ سعی آزادی بھی برابر کر رہی ہے۔ لیکن باوجود متواتر کوششوں کے اس کی سعی آزادی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ الجھتی چلی جاتی ہے۔ آسی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہاں آزادی بھی گرفتاری ہے۔

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے موج شراب یک مژۂ خوابناک ہے

ساقی کی ادائے غفلت پر مستی شراب تک ہلاک ہے۔ شراب اس کی غفلت کے ذوق میں ایسی بے خود ہوتی ہے کہ موج شراب چشم ساغر کی مژہ خواب آلود معلوم ہوتی ہے۔

بزم میں وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

بادہ کو نبض پری سے مشابہت دی ہے پھر اس کی وحشت کو ظاہر کیا ہے کہتے ہیں کس کی چشم مست نے بزم مے کو وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ وحشت کے مارے شیشے میں بصورت موج بادہ گویا نبض پری پنہاں ہے۔

موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچہ باغ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

اگر تو نشے کے عالم میں اپنی پگڑی میکدے کے کسی کونے میں بھول جائے تو تجھے اس پگڑی کو میخانے کے کونوں میں نہیں بلکہ غنچہ باغ کے خلوت خانے میں ڈھونڈنا چاہیے فیض بہار سے گوشہ میخانہ غنچہ باغ کا خلوت کدہ بن جائیگا اور تیری گمشدہ دستار موج گل ہو جائے گی۔

سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے۔ پگڑی جب تک بندھی رہتی ہے غنچہ کی شکل ہے۔

موج مے، موج رفتار، موج صبا، موج شراب، موج غم، موج خوں، موج سراب، موج بہار

موج رم آہو، موج محیط آب، موج کوثر، موج دود، موج خمیازہ وغیرہ یہ تمام تشبیہات اپنی ندرت کے ساتھ ایک حرکی تصویر پیش کرتی ہیں۔

غالب کی شاعری میں زندگی کا حرکی تصور اس طرح رچ بس گیا ہے کہ انھیں سکوت میں حرکت کے جلوے کارفرما نظر آتے ہیں۔

حرکت کا تصور غالب کے بعد، اقبال کے یہاں ہی ملتا ہے اگرچہ غالب نے کہیں واضح طور پر اس تصور کی طرف اشارہ نہیں کیا لیکن تصورات کی بوقلمونی کے پس منظر میں بھی ایک جلوہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اپنے مخصوص رمزیہ پیرایہ میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی بزرگی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس ایک لفظ کی مثال سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامتی محرکاتی لفظوں کا استعمال غالب نے کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۴ سے آگے)

ساتھ ہی ساتھ شوخی و ظرافت کی گلکاریاں بھی جیش ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ ان کے چمن شاعری میں جابجا طنز، شوخی اور ظرافت کے خیابان مرکز دل و نگاہ بنے ہوئے ہیں۔ گویا رشید احمد صدیقی کی زبان میں "غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی اور اس کو ایک ایسی فضا دی جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو برگ و بار لانے کے سامان اور سہولتیں فراہم کیں۔ یہ غالب ہی کا تصرف تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور کلچر کو غزل بنا دیا۔ اردو شاعری میں غزل کا یہ تصور دوام مبارک سمجھا جائے یا نامبارک، حیرت انگیز ضرور ہے۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان پر ہم اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

---

[1] "احوال و نقد غالب" مرتبہ محمد حیات خاں

سب رس کا غالب نمبر

قارئین کی نظر میں

سب رس، ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد کا ماہانہ رسالہ ہے۔ جسے مرحوم ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۸ء میں جاری کیا تھا۔ اُردو کی ترقی اور ترویج میں ڈاکٹر زور مرحوم اور ادارہ ادبیات اُردو کی خدمات کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ سب رس کے غالب نمبر میں اگرچہ دو تین مضمون غالب کی سوانح عمری کی ذیل میں آتے ہیں لیکن بیشتر مضامین کا تعلق اس کے فن سے ہے۔ مضامین کا معیار بالعموم بلند ہے اور یہ محنت سے لکھے گئے ہیں۔ آخر میں ایک حصہ منظومات کیلئے وقف ہے ان میں سے بھی ایک حصہ ان نظموں پر مشتمل ہے جس میں مختلف شعراء نے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے دوسرے حصہ میں وہ چند غزلیں ہیں جو غالب کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔

بہر حال یہ پرچہ ہر طرح کامیاب ہے

(مالک رام ۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

●

غالب صدی کے دوران میں کئی رسالوں نے اپنے غالب نمبر شائع کئے، اور غالب کے فن پر اور ان کے ذاتی حالات پر ان میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اب کسی رسالے کے غالب نمبر کے لئے میدان بہت محدود رہ گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ پروفیسر اکبر الدین صدیقی کی ان تھک محنت اور خلوص سے ایک اور شاندار خصوصی نمبر سب رس کے غالب نمبر کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ موصوف نے گویا ایک پٹی ہوئی زمین میں ایک مرصع غزل لکھ ڈالی۔

تین سو اٹھائیس صفحات کے سب رس غالب نمبر میں کیا کچھ نہیں ہے۔ غالب کی حیات شخصیت اور ان کے فن پر کتنے اچھے مضامین اس غالب نمبر میں پتہ نہیں کہاں کہاں سے حاصل کر کے شامل کئے گئے ہیں مشہور اور نامور ادیبوں اور ناقدوں کے ایک دو نہیں اکٹھے ۳۸ مقالے، غالب کی مدح میں (۸) غالب کی زمین میں (۹) اور تضمین غالب میں ۲ منظومات، غالب پر شائع شدہ رسالوں کے خصوصی (۱۱) شماروں اور ۲ کتابوں پر

تبصرہ: یہ ہیں سب رس کے غالب نمبر کے محتویات بیشتر مقالے جاندار، وقیع، خاصہ کی چیز غالب کے مشہور شاگرد اور شیدائی حبیب اللہ ذکا کے نواسے کا مضمون محمد حبیب اللہ ذکا یوسف ناظم کا مضمون غالب اور ملازم سرکار اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں مرتب کا مضمون "غالب اور دکن" پروفیسر عصمت جاوید کا مضمون نسخہ حمیدیہ ایک جائزہ اب کہاں تک نام گنائے جائیں سب ہی مضامین اپنی جگہ خوب اور بہت خوب۔

سب رس کا غالب نمبر غالبیات کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اس کے مرتب کرنے پر پروفیسر اکبر الدین صدیقی اور اس کے شائع کرنے پر ادارہ ادبیات اردو دونوں قابل مبارک باد ہیں۔

پروفیسر مبارز الدین رفعت

●

سب رس کا غالب نمبر مل گیا بہت حسین، بہت دلچسپ اور بہت ضخیم، مبارکباد قبول کیجئے میں سمجھا تھا کہ معمولی سا نمبر نکل جائے گا آپ لوگوں نے تو کمال کر دیا اور اپنا وقار بنا لیا ہندوستان سے جتنے غالب نمبر شائع ہوئے ہیں ان میں آپ کا نمبر اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔ "بھوپال اور غالب" کے تبصرے میں آپ نے تحریر کیا ہے کہ "یہ قلمی دیوان (نسخہ حمیدیہ) آجکل امروہہ میں موجود ہے[1]" جی نہیں یہ دوسری چیز ہے نسخہ حمیدیہ نہیں نسخۂ بھوپال اب تک نہیں ملا ہے اور دیکھئے ملتا بھی ہے کہ نہیں "غالب صدی" کے سلسلے میں غالب نمبروں اور کتابوں کا جائزہ مکمل نہ ہو سکا۔ کم سے کم ہندوستان سے شائع شدہ نمبروں اور کتابوں کا تفصیلی جائزہ تو ہونا چاہیے تھا[2] بہر حال آئندہ نمبر میں اس کمی کو دور کر سکتے ہیں آئندہ نمبر کب تک شائع کرنے کا خیال ہے۔

بہر حال میری طرف سے ایک بار پھر مبارکباد قبول کیجئے۔

(پروفیسر) عبدالقوی دسنوی (سیفیہ کالج بھوپال)

●

سب رس کا غالب نمبر اتنا ضخیم نکلے گا اس کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔ چونکہ یہ ایک اہم ادبی دستاویز ہے اس لئے سرورق کیلئے کارڈ پیپر استعمال کیا جاتا تو بہتر تھا

(پروفیسر) صفی الدین صدیقی آرٹس اینڈ سائنس کالج اورنگ آباد

---

[1] مجھ سے غلطی ہو گئی معذرت خواہ ہوں [2] ادارہ میں آنے والے رسائل اور کتابوں ہی پر تبصرہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں شائع ہونے والے تمام رسائل اور کتب پر اسی وقت تبصرہ لازماً ہوتا جب کہ وہ تبصرے کیلئے سب رس کو ملتے۔

●

غالب نمبر ملا۔ دیکھتے ہی طبیعت باغ باغ ہو گئی اتنی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا گیا ہے کہ بغیر تبصرہ کئے دل نہیں مانتا سرسری طور سے صرف عنوانات، فہرست، ذیلی عنوانات اور پیش لفظ دیکھ پایا ہوں اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نمبروں کے مقابلے میں جدت، تنوع اور انفرادیت سے کام لیا گیا۔ بالکل اچھوتے موضوعات ہیں اور غالب کے نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جو یقیناً مواد و متن کے اعتبار سے قابل قدر اور انوکھی چیز ہے۔ مکمل پڑھنے کے بعد میں انشاء اللہ ضرور اپنی حقیر رائے رقم کرنے کی کوشش کرونگا ابھی تو غالب نمبر کی رسید کے ساتھ ساتھ اپنا پہلا تاثر بھیج رہا ہوں۔ اتنی سادگی اور اس قدر بصیرت افروز مواد اور وہ بھی اپنے رنگ میں منفرد۔ قابل صد ستائش ہیں آپ کی مساعی جمیلہ۔

شوکت علی خاں۔ ناظم ادارہ تحقیقات عربیہ ٹونک راجستھان

●

غالب نمبر آخر مل گیا۔ مجھے تو حیرت اس پر ہے کہ وسائل اتنے محدود ہونے پر اتنا شاندار نمبر آپ کیسے نکال سکے اور پھر اس کا ضمیمہ بھی نکال رہے ہیں بہر حال میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائے آپ کا یہ نمبر بقامت بھی اور بقیمت بھی بہتر ہے۔

محمد حسین احسان ایڈیٹر "پیام تعلیم"، جامعہ ملیہ دہلی

●

سب رس کا غالب نمبر موصول ہو چکا ہے۔ شکر گذار ہوں۔

مقررہ وقت پر غالب نمبر کی کامیاب اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ تصاویر، عکس تحریر، مضامین، منظومات، نقد و نظر سب ہی شمولات نہایت قابل قدر ہیں۔ اکثر مضامین نئے پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں اور غالبیات میں نئے رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو رسائل کے غالب نمبروں میں سب رس کے غالب نمبر کو خاص اہمیت حاصل ہوگی اور غالب صدی منانے میں حیدرآباد کی نمائندگی کے طور پر بھی یہ نمبر یادگار رہے گا۔

اپنی بات میں یہ پڑھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ وقت کی کمی کے باوجود اتنے مضامین فراہم ہو گئے کہ آپ نے ایک اور حصہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے امید ہے یہ دوسرا حصہ بھی آپ کے حسن ترتیب کی بدولت علمی و ادبی محاسن سے مزین ہوگا۔

جیسا کہ آپ کے علم میں آچکا ہوگا، "نقد و نظر" کے حصے میں دیوان غالب نسخہ بھوپال اور نام نہاد نسخہ امروہہ کے ذکر میں آپ سے سہو ہو گیا ہے۔ موخرالذکر تملی دیوان نسخہ بھوپال سے مختلف اور قدیم ہے حالانکہ

بھوپال ہی سے دستیاب ہوا ہے میری رائے میں اسے نسخہ بھوپال دوم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اگرچہ زمانہ کتابت کے اعتبار سے اسے اولیت حاصل ہے　　مخلص

ڈاکٹر) ابو محمد سحر
پروفیسر و صدر شعبہ اردو حمیدیہ کالج بھوپال

●

—— اس ہفتے تھوڑی سی فرصت ہوئی تو آپ کا غالب نمبر پڑھ ڈالا۔ خیال تو یہی تھا کہ غالب پر اس دوران میں اتنا لکھا گیا ہے کہ اب کوئی نئی بات کہنی مشکل ہے۔ لیکن اس کے مطالعہ کے بعد میری یہ پیش خیالی غلط ثابت ہوئی غالب یقیناً ایک ایسا گہرا سمندر ہے کہ ہر وقت ہر غوطہ خور اور ہر تیراک اس کی تہہ سے کوئی نیا موتی کوئی نیا خزانہ نکال ہی لاتا ہے ..... سبھی لکھنے والوں کے مضامین اپنی اپنی ایک انفرادیت رکھتے ہیں اور ہر مضمون میں کوئی نیا پس منظر پیش کرنے کوئی نیا پہلو سامنے لاتے اور کوئی نئی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے

پروفیسر سید محمد نے " غالب خستہ جاں " میں یہ بڑی پتہ کی بات کہی ہے کہ "شمالی ہند کا عام مذاق عرصہ دراز تک غالب شناسی سے محروم تھا۔ یہ فخر و امتیاز جنوبی ہند اور خاص کر مدراس اور حیدرآباد کے شہروں کو حاصل ہے کہ غالب کی قدر سب سے پہلے اسی حصہ ملک کے لوگوں نے کی " اس طرح آپ نے بھی " غالب اور دکن " میں یہ بالکل درست فرمایا کہ " غالب نے اپنے جیتے جی حیات شمالی ہند میں اتنی شہرت اور عزت حاصل نہیں کی جتنی کہ انھیں دکن میں حاصل کرنے کا موقع ملا " دونوں مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں

حصہ نثر کے مقابلے میں حصہ نظم پہلی نظر میں کچھ تشنہ سا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کی ابتدا میں آپ نے نواب افضل الدولہ والئی حیدرآباد اور سر سالار جنگ اول سے متعلق غالب کے دو فارسی قصاید دیکر اس کمی کو کسی حد تک دور کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں " نذر غالب " میں بھی جن شعرا نے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ بھرپور ہے اور ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔

نقد و نظر کا حصہ بھی ماشاء اللہ بڑا دلچسپ ہو گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے تبصرے جاندار اور بے لاگ ہیں بلکہ ان تبصروں میں یہ اہتمام یا اتفاق کہ سب کے سب غالبیات سے متعلق ہیں بڑا با معنی ہے۔

مجموعی طور پر سب رس کا غالب نمبر بہت معیاری ہے، جنوبی ہند اور حیدرآباد میں تو اس کو اولیت حاصل ہے ہی لیکن شمالی ہند سے بھی اب تک جتنے غالب نمبر شائع ہوئے ہیں ان میں تحقیق اور تنوع کے اعتبار سے بلاشبہ شاعر نیا دور، اور اردو ادب کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ خاص طور پر غالب اور حیدرآباد کی مناسبت سے جو مواد بھی آپ نے اس میں اکٹھا کر دیا ہے وہ آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اس کامیاب کوشش پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

حامد اللہ ندوی
ایم، جی، ایم ریسرچ سنٹر (بمبئی)

●

غالب نمبر ملا۔ مضامین ماشاء اللہ جامع موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ضخامت اور معیار دونوں لحاظ سے یہ نمبر کسی غالب نمبر سے کم نہیں۔ آپ کی محنت و کاوش قابل ستائش ہے۔ بقول آپ کے اس میں مستقبل کے ماہرین غالب جلوہ گر ہیں۔ معنوی طور پر یہ نمبر نہایت ممتاز اور غالبیات میں ۔۔۔ ایک قابل فخر اضافہ ہے۔

ایک بات ذرا طبیعت کو کھٹکی کہ اگر پہلا صفحہ یا ٹائیٹل کور رنگین و دلکش ہوتا تو ظاہری طور پر بھی کچھ طمطراق کی کیفیت ہوتی بہرحال وہ بھی صوفیانہ اور سنجیدہ ہے۔

ڈاکٹر احتشام احمد ندوی
لکچرار وینکٹیشور یونیورسٹی ۔ ترپتی

●

سب رس کا غالب نمبر مواد کے اعتبار سے ازحد وقیع ہے۔ وزن اور وقار کا حامل۔ غالب کی شخصیت اور فن کے کم و بیش ہر موضوع پر جامع مضامین ہیں۔ جس کے لکھنے والوں سے زیادہ ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ غالب پر چند نمبر ہی ایسے جاندار شائع ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر) سلیمان اطہر جاوید
لکچرار وینکٹیشور یونیورسٹی۔ ترپتی

●

مضامین کی ندرت، حسن ترتیب اور طباعت کے لحاظ سے بہترین نمبر ہے۔ باوجودیکہ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ چند مضامین میں نادر امور پر بحث کی گئی ہے۔ مضامین سیر حاصل ہیں

پروفیسر شیخ فرید جبل پور

●

ماشاء اللہ غالب نمبر بہ حیثیت ترتیب و تحریر بہت خوب ہے اور مقالہ نگار سوائے راقم الحروف کے قابل مبارکباد ہیں۔ آپ نے جس کد و کاوش اور دقت نظر سے غالب نمبر کو جو ترتیب و تزئین بخشی ہے وہ بجائے خود لائق تحسین اور مستحق تقلید ہے۔

عبدالغنی فاروقی
لکچرار شعبہ فارسی وینکٹیشور یونیورسٹی۔ ترپتی

●

غالب نمبر پسند آیا۔ مضامین بھی نئے ہیں ۔۔۔ محمد عالم مختار حق لاہور کا "مرزا اسد اللہ خاں غالب" بہت پسند آیا غالب اور متنبی کا مقابلہ ایک نیا اور اچھا مضمون ہے ابھی صرف تین چار مضامین پڑھ سکا ہوں آپ بھی کتاب ملی ہے۔

ماہنامہ "تحریک" دہلی

"سب رس" اردو کا بہت پرانا ماہنامہ ہے۔ اس کا اجرا مرحوم ڈاکٹر زور کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ پروفیسر سید علی اکبر کی نگرانی اور جناب محمد اکبر الدین صدیقی کی ادارت میں شایع ہو رہا ہے۔ ان دونوں حضرات نے اس کی روایات کو نہ صرف باقی رکھا ہے بلکہ آگے بھی بڑھایا ہے جو ڈاکٹر زور کے ایثار و اخلاص نے قایم کی تھیں۔ سب رس کا زیر نظر شمارہ جو غالب کی شخصیت اور شاعری پر مضامین کیلئے مخصوص کیا گیا ہے اگرچہ کچھ تاخیر سے شایع ہوا ہے لیکن مشمولات کی عمدگی نے اس تاخیر کی تلافی کر دی ہے۔ اس نمبر میں غالب کی زندگی اور اس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق اڑتیس مضامین کے علاوہ غالب کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے اور غالب کی زمینوں میں کچھ غزلیں بھی دی گئی ہیں۔ آخر میں ان کتابوں اور رسالوں پر تبصرے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو غالب صدی کے پچھلے چند مہینوں میں شائع ہوئے ہیں جن کی شمولیت نے غالب نمبر کی جامعیت میں خاصا اضافہ کیا ہے۔

(ارشد علی خاں۔ نومبر ۱۹۶۹ء)

●

ماہنامہ "جان نثار" امرتسر

"سب رس" کا غالب نمبر جو ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ غالبیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ہر کتب خانہ میں رکھنے کے قابل ہے۔ حصہ نثر میں ڈاکٹر زور کا "حیات غالب" مولانا معز الدین قادری کا "غالب اور تصوف" عبدالغنی فاروقی کا "غالب فارسی شاعری کے آئینہ میں" خاصے کی چیزیں ہیں۔ حصۂ نظم میں شعرائے کرام کا خراج عقیدت شامل ہے جن میں رونق دکنی سیمابی کی "اسد اللہ خاں غالب" اور نازش پرتاب گڈھی کی "غالب" نہایت کامیاب نظمیں ہیں۔ رسالہ کے آخر میں نقد و نظر کے تحت مختلف رسایل اور غالبیات پر نئی کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(صابر ابوہری۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

●

روزنامہ "ترجمان" لدھیانہ

حضرت غالب کی شاعری کے متعلق حیدرآباد کے مشہور اردو جریدہ "سب رس" نے باتصویر اور شاندار غالب نمبر شائع کیا ہے۔ "حیات غالب" از قلم ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایک قابل قدر مضمون ہے جس کے پڑھنے سے غالب کی زندگی کی متحرک فلم پردۂ دماغ پر آجاتی ہے۔ "غالب کی شاعری میں سماجی اور تہذیبی پس منظر" ایک اعلیٰ پایہ کا مضمون ہے۔ غالب کی شاعری میں عام بول چال سموئی گئی ہے۔ اور جناب حشم الرمضان نے اپنے مضمون میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ غالب کے قصائد کو علیحدہ باب میں یکجا کیا گیا ہے۔ آخر میں بھارت کے جن جرائد نے غالب نمبر شائع کئے ہیں ان پر تنقید کی گئی ہے۔

(۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء)